احتشام اختر کی شعری خدمات

ایک جائزہ

اختر (وزیر اعلیٰ راجستھان سے ایوارڈ لیتے ہوئے)، ڈاکٹر مدبر علی زیدی (چیئرمین
)، جناب مخمور سعیدی، ڈاکٹر بی ڈی کلاؔ (سابق ریاستی وزیر)، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ
(ڈا ں برائے فروغِ اُردو)، جناب اشوک گہلوت (سابق وزیر اعلیٰ راجستھان)

انجم آفاق

احتشام اختر کی شعری خدمات: ایک جائزہ

انجم آفاق

پیش لفظ

راجستھان کے ممتاز شعرا میں احتشام اختؔر کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ اپنی شعری و ادبی خدمات کی بنا پر کوٹہ شہر میں ہی نہیں بلکہ راجستھان میں بھی اپنا نام پیدا کر چکے ہیں۔ احتشام اختؔر کی جائے پیدائش مقدس شہر اجمیر شریف ہے جہاں علیمؔی اجمیری، معنؔی اجمیری، قابلؔ اجمیری، سیّد فضل المتین، احمد رئیسؔ، ممتاز راشدؔ، اور اعجاز اجمیری جیسے مایۂ ناز شعرا گذرے ہیں۔ اختؔر صاحب کی شاعری کی ابتدا بھی اسی شہر میں ہوئی مگر ان کے شعری ذوق کو جلا علی گڑھ نے بخشی، جہاں سے انھوں نے ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کی۔ احتشام اختؔر اب کوٹہ شہر میں ایک طویل عرصے سے سکونت پذیر ہیں۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں، جو غزلوں، آزاد نظموں اور نثری نظموں پر مشتمل ہیں۔ ان مجموعوں کے مطالعہ سے احتشام اختؔر کے ذہنی و فکری رویوں اور ان کے شعری انداز و اسلوب کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ احتشام اختؔر اگرچہ عصری حسّیت کے قائل ہیں مگر ان کے اظہار میں وہ حد درجہ محتاط بھی ہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ وہ شاعری کے تقاضوں اور فنّی اصولوں کو قربان کر کے یکسر راست بیانی کرنے لگیں۔ ان کی شاعری اپنی معنویت کے باوصف سلجھے ہوئے اندازِ بیان کی حامل ہے۔ احتشام اختؔر کی ان خصوصیات کے سبب ہی مجھے ان کی شاعری بہت پسند ہے، اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کی شاعری کا یہی عنصر ان کو راجستھان کے دیگر شعرا سے ممتاز بھی کرتا ہے۔

پیشِ نظر مقالہ ایم۔ فل (اُردو) کی ڈگری کے لیے لکھا گیا ہے۔ ماہ و سال کی

نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''بارش'' ملاحظہ فرمائیں:

کل بھی بارش ہوئی تھی
آج بھی بارش ہوگی
اور پھر
کھوکھلی عظمتیں
پیدل چلتی حسرتوں پر
کیچڑ اچھالتے ہوئے
ہوا کی طرح گذر جائیں گی
آراستہ دوکانیں
یہ تماشا دیکھیں گی
اور ہنسیں گی

ہم یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ احتشام اختر کی نظموں کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے ان کے ہاں غمِ دوراں بھی ہے اور غمِ جاناں بھی۔ غمِ دُنیا اور غمِ یار کو انھوں نے شاعری میں ایک ساتھ سمو کر اپنے شعری اظہار کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی نظمیں قاری کو نئے آفاق کی سیر کراتی ہیں اور جیسا کہ شاکرہ ناز نے لکھا ہے:

''احتشام اختر نے نظم کے میدان میں خاص طور سے راجستھان کے شعرا میں ایک نئی پہچان بنائی ہے جس سے ان کی ادبی قدر میں اضافہ ہوا ہے۔'' (جدید فکر و فن۔جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۲۷ ص ۵۸)

مذکورہ بالا رائے کی روشنی میں ہم بآسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ راجستھان میں

اُردو نظم نگاری کے میدان میں احتشام اختؔر ایک خاص اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور اس بات کا اعتراف شاکرہ ناز کے ساتھ ساتھ مشہور شاعر بشیؔر بدر نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ''نیلا آکاش'' کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''لفظوں کی مزاج شناسی اور انھیں تخلیقی انداز سے برتنے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ احتشام اختؔر اپنے شعری تجربہ کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنے میں پوری قدرت رکھتے ہیں۔ وہ تین چار مختصر ترین مصرعوں میں بڑے اہم تجربوں کے اظہار پر قادر ہیں۔
> کئی نثری نظمیں مثلاً ''روشنی کی سوغات'' طویل بھی ہیں لیکن احتشام اختؔر نے شاید کڑی خود احتسابی اور فنکارانہ حسنِ انتخاب سے کام لیا ہے۔ طویل نظموں میں بھی مصرعے آسانی سے حذف نہیں کیے جاسکتے اور پوری نظم غزل کے خوبصورت شعر یا کسی چابکدست افسانہ نگار کی کہانی کی طرح معنی خیز، مکمل اکائی نظر آتی ہے۔''

(تبصرہ ''نیلا آکاش'' ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی صفحہ ۴۶، اکتوبر ۱۹۸۶ء)

دراصل احتشام اختؔر کی نظمیں جہاں جذبات نگاری، عشق و محبت کی کیفیات، بہترین منظر کشی اور درد و کسک کی آئینہ داری کرتی ہیں وہیں ان نظموں میں انسانیت کا نوحہ، یک جہتی اور قومی اتحاد کا بیان بھی ملتا ہے۔ وہ فسادات کا ماتم بھی کرتے ہیں اور ان سے برپا ہونے والی بربادیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس کے سبب ان کی شاعری میں ایک نصیحت آمیز انداز بھی محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''ہدایت'' ملاحظہ کیجیے اس نظم میں وہ بڑے پُرکشش انداز میں ہدایت کرتے ہیں:

روشنی کی کوئی سرحد نہیں

کوئی مذہب نہیں
ہوا کا کوئی جسم نہیں
کوئی ملک نہیں
پانی کا کوئی رنگ نہیں
روشنی کو کوئی نام نہ دو
ہوا کو کوئی جسم نہ دو
پانی کو رنگین نہ بناؤ
پانی میں لہو نہ ملاؤ

اس طرح کی نظمیں زندگی کی ان سچائیوں کی ترجمان ہیں جو شاعر کے خیال اور فن میں نمایاں رول ادا کرتی ہیں۔ ان جذبوں سے زندگی توانائی حاصل کرتی ہے۔ یہ جذبے انسانی اقدار کو زندہ رکھتے ہیں۔ اور یہ نظمیں ذات و کائنات کے رشتوں کو استوار کرتی ہیں۔

احتشام اختر کی زندگی بہت کرب والم میں گذری تھی اور اس کا عکس ان کی نظموں میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیں زندگی کی حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ اس ذیل میں ان کی چند نظمیں بہ عنوان ''مایوسی''، ''راکھ''، ''دکھ''، ''انتقام''، ''بے نام اُداسی'' اور ''دُعا'' قابلِ ذکر ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کی اک نظم ''دُعا'' ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں انھوں نے اپنے دلی جذبات و کیفیات کو الفاظ کی لڑی میں پرو کر ایک خوبصورت نظم کی شکل میں ڈھال دیا ہے، اور یہ ایک کامیاب شاعر کا ہی کمال ہے کہ جن جذبات و احساسات کو وہ محسوس کرتا ہے اس کو اپنی نوکِ قلم سے الفاظ کا جامہ پہنا کر اس میں اثر پیدا کرتا ہے:

اے خدا!
تو قادرِ مطلق ہے

تو میرا باپ بن کر
نیچے آ
کہ میرا باپ نہیں ہے
میں تجھے پاپا کہہ پکاروں
یا خدا!
تو میری ماں بن کر
میرے پاس آ
کہ میری ماں نہیں ہے
میں تجھے امّی کہہ کر تیرے سینے سے
لگ جاؤں
اے خدا!
تو میرا مخلص دوست بن کر
میرے پاس آ
کہ میرا کوئی
مخلص دوست نہیں ہے

(دُعا)

نظم ''دُعا'' دل پر اثر کرنے والی نظم ہے۔ اس نظم میں ان کا ذاتی غم سمٹ آیا ہے اور والدین کی کمی کا احساس اور ایک مخلص اور ہمدرد دوست کے نہ ہونے کا غم انھوں نے انتہائی پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔

ان کی ایک نظم بہ عنوان ''شرارتی'' بھی بڑی خوبصورت نثری نظم ہے جس میں انھوں نے خوشی اور غم کو اپنا بھائی بہن قرار دیا ہے۔ غم اور خوشی کا جو حسین امتزاج انھوں نے اس نظم میں پیش کیا ہے وہ بڑا موثر ہے چنانچہ اس مقام پر مذکورہ نظم کا مطالعہ بھی ضروری ہے:

خوشی اور غم
میرے دونوں بہن بھائی
بہت شرارتی ہیں
جب بھی میرے گھر آتے ہیں
نہ خط لکھتے ہیں نہ تار دیتے ہیں
بس اچانک آجاتے ہیں
مجھے سرپرائز دینے میں
دونوں کو
مزہ آتا ہے

اس طرح کی نظمیں زندگی کی ان سچائیوں کی ترجمان ہیں جو شاعر کے خیال اور فن میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔

آج راجستھان میں نثری نظم اور آزاد نظم یعنی صنفِ نظم کی تمام ہیئتیں اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ موجود ہیں اور زندگی کے بدلتے ہوئے رویوں کو بخوبی پیش کررہی ہیں۔ اور اس لحاظ سے دیکھیں تو احتشام اختر کی نظمیں کامیاب نظر آتی ہیں اور احتشام اختر کی جن نثری نظموں کو نقادوں نے خاص طور پر پسند کیا ہے ان میں ''شامِ فراق''، ''ترکِ تعلق کے بعد''، ''عبرت''، ''اندھیرے سے پیار''، ''انتقام''، ''فاحشہ''، ''وہ ایک شخص''، ''روشنی کا غلام''، ''کوڑے دان''، ''مشورہ''، ''شرارت''، ''کوشش''، ''دل کا آنگن'' اور ''آسمان'' وغیرہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے ان کی بیشتر نظموں کی پذیرائی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''.....پیشِ نظر نظموں میں 'شرارت'، 'کوشش'، 'دل کا آنگن'، اور 'آسمان' جیسی تخلیقات سے جھلکتی ہوئی معصوم شوخی، کھلنڈراپن اور جرأتِ اظہار

دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔'' (کتاب نما' دہلی' جائزے نمبر)

ڈاکٹر مظفر حنفی کی یہ رائے کسی غلط فہمی کا نتیجہ نہیں ہے اس کی مزید تائید کے لیے میں احتشام اختر کی نظم ''شرارت'' (جو مظفر حنفی صاحب کی پسندیدہ نظموں میں سے ایک ہے) یہاں پیش کرنا چاہوں گی:

دل کا بجھا ہوا دیا
میں نے پھر جلا دیا ہے
ہوا اسے پھر بجھا دے گی
ہوا مجھے ستاتی ہے
میں ہوا کو ستاؤں گا
دل کا بجھا چراغ
میں بار بار جلاؤں گا

اسی طرح اوپندر ناتھ اشک نے بھی ان کی بعض نظموں کو پسند کیا ہے چنانچہ ایک تبصرے میں لکھتے ہیں:

''.....'غم'، 'تماشا'، 'جسارت'، 'نیلا آکاش'، 'رسوائی'، 'شرارتی'، 'اندیشہ'، 'دل کا آنگن'، 'نیند کی خواہش'، 'تین نظمیں' مجھے بہت اچھی لگیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دوبارہ پڑھنے پر اور بھی اچھی لگیں گی اور یاد رہ جائیں گی۔ 'حسرت'، 'کوڑے دان' اور ایک الوداعی نظم، مؤخر الذکر نظم دل پذیر ہے۔ جوانی کی یاد دلائے گی۔''

آخر میں میں یہ عرض کرنا چاہوں گی کہ احتشام اختر عوام و خواص دونوں کے مقبول شاعر

ہیں۔ان کی شاعری اپنے موضوع اور مضامین کے تنوع کے باعث اہلِ نظر کو متاثر کرتی رہی ہے اور جب بھی راجستھان کے جدید شعری ادب کا غائر مطالعہ کیا جائے گا تو مجھے یقین ہے کہ اس مطالعے میں احتشام اختؔر کو ان کی نظمیہ شاعری کی بنا پر بھی نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

OO

باب پنجم

راجستھان میں اُردو شاعری میں

احتشام اختؔر کا مقام

○

عام طور سے شعرا مقطع میں اپنی تعریف کرتے ہیں جسے شاعری کی اصطلاح میں تعلّی کہا جاتا ہے اور یہ تعلّی یا خودستائی بُری نہیں سمجھی جاتی ہے۔ لیکن احتشام اختؔر کی شخصیت اور شاعری کا بھی یہ قابلِ قدر پہلو ہے کہ انھوں نے اپنے کسی شعر میں اپنی تعریف نہیں کی۔ اِسے اُن کی منکسر المزاجی اور کسرِ نفسی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا اندازِ سخن منفرد اور نرالہ ہے اور نقّادوں نے ان کی شاعرانہ اہمیت اور انفرادیت کو تسلیم کیا ہے اور یہ صحیح بھی ہے کہ ہم اپنی تعریف خود کرنے کے بجائے یہ دیکھیں کہ دوسرے لوگ ہماری شاعری کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر مختار شمیم ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اُردو شاعری کے نئے منظر نامے میں احتشام اختؔر کا نام تیزی سے اُبھرا ہے اور اب وہ جدید شعری روایت کی ایک مضبوط کڑی بن چکے ہیں۔ نئے ناموں میں ان کی شناخت منفرد احساس کے شاعر کی ہے۔''

(تبصرہ ''صبح کا ستارہ'' ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی ۱۵ر جون ۱۹۹۲ء)

احتشام اختؔر کے اب تک تین شعری مجموعے شایع ہوئے ہیں۔ پہلا ''راکھ'' کے عنوان سے ۱۹۷۴ء میں، دوسرا ''نیلا آکاش'' کے نام سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ خالص نثری نظموں پر مشتمل ہے اور تیسرا شعری مجموعہ ''صبح کا ستارہ'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا

تھا۔ ''صبح کا ستارہ'' احتشام اختر کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ نظم وغزل کے علاوہ ان کے مضامین اور افسانے بھی ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلام محض شائع شدہ شعری مجموعوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ متعدد انتخابات اور رسائل و جرائد میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ جن میں ''شیرازہ'' مرتبہ مخمور سعیدی/ پریم گوپال متل ''روحِ غزل'' مرتبہ ڈاکٹر مظفر حنفی، ''ترسیل اور جل ترنگ'' مرتبہ مناظر عاشق ہرگانوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

احتشام اختر دورِ جدید کے اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ جدید موضوعات کو انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں جدید رجحانات اور عصری حسیّت کی ترجمان ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری سے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی جدید طرزِ احساس کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ اجمیر کے قیام کے دوران انھوں نے ''انجمن فنکارانِ نو'' کی بنیاد ڈالی اور کوٹہ آنے کے بعد ۱۹۸۸ء میں انھوں نے ایک اور ادبی انجمن ''ہم سخن'' قائم کی۔ ان انجمنوں کا مقصد جدید طرزِ احساس کو ادبی سطح پر بامعنی بنانا تھا۔ غالباً اسی لیے بشیر بدر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:

''.....جدید شاعری کا تذکرہ احتشام اختر کے بغیر ادھورا ہے۔''

(''راکھ'' اہلِ نظر کی نظر میں ''مشمولہ'' نیلا آکاش'' ص ۱۰۸)

احتشام اختر فطرتاً روایت شکن رہے ہیں اور جدید ادب سے انھیں ابتدا سے ہی رغبت رہی ہے۔ یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ وہ جدید شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم کلاسیکی شاعری کو بھی جاننا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں نئی روایتوں کو قائم کرنے کے لیے قدیم ادبی روایات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کی اسی خوبی کی طرف ایک تبصرے میں لکھا گیا ہے کہ:

''ان کی طبیعت کا میلان شروع سے جدید ادب کی طرف رہا ہے۔ لیکن قدیم ادب کی طرف سے بھی انھوں نے کبھی غفلت یا بے اعتنائی نہیں

پابندی کے سبب اس کا امکان ہے کہ اس میں کچھ خامیاں موجود ہوں جن سے فوری طور پر صرفِ نظر کی درخواست ہے۔ کیونکہ یہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے کے لیے یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایک ایسے شخص کی رہبری نصیب ہوئی جس کا خلوص، جس کی مشفقانہ سرپرستی اور عنایاتِ بے پایاں میرے شاملِ حال نہ ہوتیں تو میں اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کی وجہ سے شاید اس مقالے کو کبھی پورا نہیں کر پاتی۔ وہ قابلِ احترام شخصیت جس کی نگرانی اور رہبری مجھے نصیب ہوئی وہ استاذی محترم پروفیسر فیروز احمد صاحب صدر شعبۂ اُردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی جے پور کی ہے جن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ قاصر ہیں میں ان کی تاعمر ممنون رہوں گی۔

اس مقالے کی تکمیل میں میں اپنے ماموں جناب سلیم رابنس (Robins) اور اپنی نانی محترمہ فیاض بیگم کی بہت شکر گذار ہوں اور اپنی والدہ محترمہ مہر آفاق کی شکر گزار تو کیا احسان مند ہوں کہ تمام مصروفیات اور دُشواریوں کے باوجود میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور مجھے اپنے والد کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اللہ سے دُعا ہے کہ ان کا سایہ میرے سر پر قائم رکھے۔ آمین۔

میں اس موقع پر اپنے والد جناب آفاق علی خاں (مرحوم) کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ جن کی دُعائیں ہمیشہ میرے ساتھ ہیں۔ اس وقت اگر وہ حیات ہوتے تو میرے اس مقالے کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوتے۔ خدا ان کی روح کو ثوابِ دارین عطا کرے۔ آمین۔

میں اپنی دوستوں، جو میری ہم جماعت بھی ہیں، روبینہ، رومانہ اور وسیمہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا پیار اور مفید مشورے قدم قدم پر میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ اپنے جونیئر فاروق جو میرے چھوٹے بھائی کی جگہ ہیں ان کی بھی شکر گذار ہوں۔

یہاں سخت ناسپاسی ہوگی اگر محترم غوث شریف عارفؔ صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے کتابت کی ذمہ داری قبول کر کے مجھے بہت سی دقتوں سے بچالیا۔

میں اپنے شعبۂ اُردو کے تمام اساتذہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو وقتاً فوقتاً

برتی بلکہ ان کی رایوں پر انحصار کرنے کے بجائے خود اصل متن کو پڑھیں سمجھیں اور رائے قائم کریں۔''

(قرطاس ناگپور ص ۴۵، جولائی-اگست ۱۹۸۶ء، جلد نمبر-۳، شمارہ-۶)

احتشام اختر ایک باصلاحیت شاعر ہیں اور شاعری ان کی فطرت میں رچی بسی ہے۔ شاعری کو انھوں نے ذریعۂ شہرت نہیں بنایا۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربوں کو عصری تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کے کلام کا بڑا حصّہ جاذب نظر اور فکر انگیز ہونے کے علاوہ مؤثر بھی ہے۔

جب ہم کسی بھی شاعر کے شاعرانہ مرتبے کا تعین کرتے ہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس کے ہم عصر شعرا کی شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے یہ تلاش کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کون سی خصوصیات ہیں جو اسے اپنے معاصر شعرا سے منفرد بناتی ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہم سب سے پہلے راجستھان میں نظم گوئی کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

صنفِ نظم گوئی ایک سن رسیدہ صنف ہے اور آج بھی اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ زندگی کے بدلتے ہوئے رویوں کو پیش کر رہی ہے۔ راجستھان میں جن نظم گو شعرا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں وہ غازی بیکانیری، خوشتر مکرانوی، سالک عزیزی، خداداد مونس، راہی شہابی، شین کاف نظام، شاہد میر، سیّد فضل المتین، ممتاز شکیب، منان راہی، آفتاب اجمیری، شاہد عزیز اور عقیل شاداب ہیں۔ ان میں پابند نظم بھی ہے اور معریٰ اور آزاد نظم بھی لیکن احتشام اختر تک آتے آتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پابند نظم نے پوری طرح نثری نظموں کا روپ اختیار کر لیا ہے، چنانچہ خوشتر، فضل المتین، ممتاز شکیب، شین کاف نظام اور عقیل شاداب کے بعد جس شاعر کی نظموں پر ہماری نظر ٹھہرتی ہے، وہ احتشام اختر ہیں۔ انھوں نے اپنی آزاد اور نثری نظموں کو جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس سے ان کی چابک دستی کا ثبوت ملتا ہے۔

کوٹہ میں نظمیں لکھی تو گئی ہیں مگر نثری نظموں میں احتشام اختر نے ناقابلِ فراموش

کارنامہ انجام دیا ہے۔ یوں تو ان کی نثری نظموں کا ایک مجموعہ ''نیلا آکاش'' الگ سے شائع ہو چکا ہے مگر اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد نظمیں رسائل وغیرہ میں چھپتی رہی ہیں۔ اگر ان نظموں کو یکجا کر دیا جائے تو ایک مجموعہ اور تیار ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں ثقیل اور ادق الفاظ کا استعمال نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ کوئی ایسا موضوع اختیار کرتے ہیں جسے پڑھ کر قاری کو شرمندہ ہونا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ عریانیت ان کے کلام میں دُور دُور تک نظر نہیں آتی، اور ان کی نظموں یا شاعری کا یہ انداز انھیں اپنے معاصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ کوٹہ شہر میں ان کے ہم عصر عقیل شاداب نے بھی نظم گوئی کی جانب سنجیدگی سے توجہ کی ہے۔ انھوں نے متعدد موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ انھوں نے عصری مسائل کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں رومانیت سے لبریز ہیں لیکن ان میں جنسیت بھی در آئی ہے مثلاً ''نظم'' مشت زنی''، ''خود شناسی'' اور ''دو روپ'' وغیرہ میں جنسیت کا بیان ساری حدیں توڑتا نظر آتا ہے مگر احتشام اختر کے یہاں جنسی بیان اس حد تک فحش اور بھدا نہیں ہوتا اور ان کی شاعری کی یہی خوبی انھیں اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت بخشتی ہے۔ ان کی ایک نظم ''زخمی صدا کی موت'' میں ان کی رومانیت کے ساتھ جنسیت کا رنگ بھی نمایاں ہے تاہم معیار سے گرا ہوا نہیں ہے۔ اس میں انھوں نے کنواری حاملہ محبوبہ کی خودکشی کا بیان بڑے درد انگیز انداز میں کیا ہے اور اس کے پس منظر میں سماجی رسم و رواج پر ایک طنز بھی ہے۔ یہ نظم پہلے درج کی جا چکی ہے۔

اس نظم کے علاوہ ایسی متعدد نظمیں ہیں جن سے ان کے شاعرانہ مرتبے کا تعین ہوتا ہے۔ شاہد عزیز اودے پور کے ایک اہم شاعر ہیں اور احتشام اختر کے معاصرین میں شمار ہوتے ہیں انھوں نے بھی مختصر نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں بھی وہی رنگ نمایاں ہے جو عقیل شاداب کے یہاں ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیں:

اور جب میں
اندھیروں کی حد پار کر کے
اُجالوں میں آیا
میری دونوں آنکھیں پھٹی رہ گئیں
میرے سامنے کوئی ننگا کھڑا تھا

اس نظم کے متعلق خلیل تنویر نے لکھا ہے:

''شاہد عزیز چاہتے تو نظم کے آخری مصرعے کو ذرا علامتی بنا کر خوبصورت بنا سکتے تھے لیکن نظم کہہ دینے کے بعد اس پر نظرِ ثانی کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔'' (رسالہ ''رنگ'' شمارہ اکیسواں ص ۶۳)

احتشام اختر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری پر نظر ثانی کرنے کے بعد ہی اُسے پیش کرتے ہیں مگر ہم صرف اس بنا پر شاہد عزیز کی تمام نظموں کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس نظم کے علاوہ ان کی متعدد نظمیں ہیں جو بڑی پُر اثر ہیں اور قاری پر گہرے تاثرات چھوڑتی ہیں مثلاً: ''اندھی گلی''، ''اَن کہی''، ''نئی زندگی'' اور ''شکست'' وغیرہ۔

احتشام اختر صرف نظم کے میدان میں ہی نہیں بلکہ غزل گوئی میں بھی ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ اس بات کا ذکر گذشتہ ابواب میں ہم کر چکے ہیں کہ ان کی غزل گوئی ان کی شاعرانہ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا آئینہ ہے۔ اس آئینے میں ان کی جذباتی اور حساس طبیعت کے مختلف مسائل، تنہائی، محبوب کا غم، ہجر و وصال، اور اخلاقی قدروں اور سیاسی سماجی تقاضوں کا بیان ان کے یہاں خوب ہوا ہے۔ احتشام اختر کے یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ زندگی اور سماج کے سرد و گرم سے گھبرا کر دُنیا سے دُور نہیں جا پڑتے بلکہ تاریکی اور ظلمت میں نورِ سحر کے متمنی ہوتے ہیں۔

دراصل یہیں سے ان کی شاعری کا وہ پہلو نمایاں ہوتا ہے جس میں بلا کی کشش ہے، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعرانہ سطح پر وہ ایک بہتر سماج کی تعمیر و تشکیل کے لیے کوشاں ہیں۔

احتشام اختر کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سادہ اور عام فہم زبان میں ہیں مگر یہ سادگی اور سلاست بے معنی اور سپاٹ نہیں ہے بلکہ اس میں معنویت اور تہہ داری بھی ہے اور ایک لطیف سا ابہام بھی ہے جو ان کی شاعری کے حسن کو دو بالا کر دیتا ہے۔ احتشام اختر کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

شہر میں سب پریشان ہیں
ایک اختر ہی تنہا نہیں

اسی نوعیت کا ایک شعر جو احتشام اختر کے معاصر شاعر سعید محوی کی غزل سے ماخوذ ہے ملاحظہ فرمائیں:

زندگی کیا ہے بس اتنی تو خبر ہے محوی
جسم خاکی سے ہر اک سانس پریشاں نکلا

مقطع میں دونوں شاعروں نے اپنے اپنے موضوع کو بڑی چابکدستی سے خوبصورت الفاظ کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ احتشام اختر کا شعر سہل ممتنع کی مثال ہے اس کے ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی کا بیان بہت کم الفاظ میں بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے۔ اسی طرح خلیل تنویر کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

تو مجھ کو بھولنا چاہے تو بھول سکتا ہے
میں ایک حرفِ تمنا تری کتاب میں ہوں

جہاں کتاب، حروف یا باب جیسی علامتوں کا ذکر آتا ہے تو وہاں احتشام اختؔر بھی پیچھے نہیں رہتے اور ایسے شعر کہہ دیتے ہیں جو ان کی شاعرانہ صلاحیت کو نمایاں کر دیتے ہیں:

پھاڑا مجھے تو سلسلہ پھر ٹوٹ جائے گا
میں بھی تو اک ورق ہوں تمھاری کتاب کا

زندگی کی کتاب میں اختؔر
اک محبت کا باب ہونا تھا

مری حیات کو بے ربط باب رہنے دے
ورق ورق یوں ہی غم کی کتاب رہنے دے

بہر حال مندرجہ بالا مثالوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو احتشام اختؔر کے شاعرانہ مرتبے اور قدر و قیمت کا تعین زیادہ مشکل نہیں۔ چنانچہ احتشام اختؔر کے بارے میں اپنی طرف سے کوئی رائے ظاہر کرنے سے پہلے ان کی شخصیت اور فن کے متعلق مشاہیرِ ادب کی گراں قدر اور بے لاگ آرا یہاں پیش کرنا چاہتی ہوں تا کہ ان کی روشنی میں احتشام اختؔر کی قدر و قیمت اور ان کا مقام متعین کرنے میں آسانی ہو۔

بقولِ بشیر بدؔر:

''وہ (احتشام اختؔر) غزل کے شاعر ہیں ان کے مزاج میں غزل کی پُرسوز اور مہذّب داخلیت رچ بس چکی ہے۔ لفظوں کی مزاج شناسی اور انھیں تخلیقی انداز میں برتنے کا فن انھیں خوب خوب آتا ہے۔ احتشام اختؔر

اپنے شعری تجربے کو کم سے کم الفاظ میں حسن سے بیان کرنے میں پوری قدرت رکھتے ہیں۔ وہ تین چار مختصر ترین مصرعوں میں بڑے اہم تجربوں کے اظہار پر قادر ہیں۔''

(ماہ نامہ آج کل نئی دہلی ص ۴۶ شمارہ ۳ جلد ۴۵، اکتوبر ۱۹۸۶ء)

بقول طارق کفایت:

''.....احتشام اختر کے ہاں بات کہنے کا ہنر بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس ہنر کی ضیا پاشی غزلوں کی طرح نظموں میں بھی نمایاں ہے۔''

('پروازِ ادب' پٹیالہ ص ۷)

بقول اطہر فاروقی:

''.....ہندوستان کی کامیاب نثری نظموں کی جب بات کی جاتی ہے تو احتشام اختر کا نام لیا جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ لفظوں کے خوبصورت استعمال، شدّتِ احساس اور سلیقۂ اظہار نے ان کی نثری نظموں کی فضا کو قابلِ قبول بنا دیا ورنہ اُردو شاعری میں غنائیت کی بات کرنے والے اور اسی حوالے سے نثری نظم کو قابلِ استرداد ٹھہرانے والے لوگ انھیں کسی بھی قیمت پر تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔'' (ایوانِ اُردو دہلی)

بقول عشرت ظفر:

احتشام اختر نئی نسلوں کے شعرا میں اس نقطۂ نظر سے ممتاز ہیں کہ ان کے یہاں الفاظ کے برتنے کا منفرد سلیقہ ہے.....الفاظ اُن کے راز دار ہوتے

ہیں اور کشفِ معانی کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے۔''

(خرام، کانپور ص ۲۸۔ جون ۱۹۹۷ء)

بقول ڈاکٹر مختار شمیم:

''احتشام اختؔر کی شاعری کو کسی خاص نظریے یا ازم کے تحت پرکھنا ناانصافی ہوگی۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے جو ادبی معیار اپنے لیے مقرر کیا ہے، وہ ان کے فن کو کس حد تک اعتبار بخشتا ہے۔''

(ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی ۱۵ر جنوری ۱۹۹۲ء)

احتشام اختؔر عوام و خواص دونوں کے مقبول شاعر ہیں۔ احمد رئیس نے ہندوستان سے پاکستان جانے کے بعد اجمیر کی یاد میں ''رفیقانِ اجمیر'' کے عنوان سے جب نظم لکھی تو انھوں نے اجمیر کے اہم اور ممتاز شعرا میں احتشام اختؔر کا بھی ذکر کیا ہے۔ نظم کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

جیسے قابلؔ کے خوبصورت شعر
اتنے پیارے ہیں اس دیار کے لوگ
راشدؔ و احتشامؔ اور متینؔ
کیسے کیسے ہیں اس دیار کے لوگ

احتشام اختؔر ایک کامیاب شاعر ہیں، نظموں اور غزلوں میں اپنا ایک منفرد رنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور اب وہ اس راہ پر گامزن ہیں جہاں فکر و فن دونوں یکجا ہو کر شاعری کو ایک خاص مقام عطا کرتے ہیں۔

OO

باب ششم

انتخابِ کلام

منقبت

ننھا سا اک دیا ہوں ، اجمیر والے خواجہ
آندھی میں جل رہا ہوں ، اجمیر والے خواجہ

میرا نہیں ہے کوئی بس آپ کے علاوہ
بے بس ہوں بے نوا ہوں ، اجمیر والے خواجہ

ٹوٹی ہوئی ہے کشتی دے دو اسے سہارا
طوفاں میں گھر گیا ہوں ، اجمیر والے خواجہ

یہ آپ کا کرم ہے میں اپنے دشمنوں سے
تنہا ہی لڑ رہا ہوں ، اجمیر والے خواجہ

غزل

میرے ہی بدن کے لیے تلوار بھی ہوگی
یہ ٹھنڈی ہوا باعثِ آزار بھی ہوگی

گونجی تھی جو آواز مری دشت میں اک دن
معلوم کسے تھا کہ گرفتار بھی ہوگی

بستی سے بہت دُور بیاباں میں کبھی موت
یاروں کے لیے سُرخیِ اخبار بھی ہوگی

جس چیز کو چوروں کی طرح دیکھ رہے ہو
گر جائے گی ہاتھوں سے تو جھنکار بھی ہوگی

چلتے رہو یونہی کہ یہ پتھریلی گذر گاہ
قدموں سے ہمارے کبھی ہموار بھی ہوگی

آسان سمجھ کر جسے گذرے ہیں کئی بار
معلوم نہ تھا راہ وہ دُشوار بھی ہوگی

سوچا ہی نہ تھا اس دلِ نافہم نے اختؔر
پھینکے گا اگر تیر تو یلغار بھی ہوگی

میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

آخر میں احتشام اختؔر صاحب اور ان کی بیگم قیصر جہاں صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں جن سے میری اکثر ملاقاتیں رہیں۔اور اختؔر صاحب نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود مواد کی دستیابی میں میری مدد کی۔

احتشام اختؔر پر بہت کم لکھا گیا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔میرا یہ مقالہ اس سلسلے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔اُمید ہے کہ اہلِ نظر حضرات میری اس کوشش کو پسند فرمائیں گے۔شکریہ۔

——انجم آفاق

غزل

ورقِ دل پہ کوئی نقش بنایا ہوتا
آس کے رنگوں سے پھر اس کو سجایا ہوتا

میں کہ دریا تھا، سمندر سے مجھے ملنا تھا
غم کا صحرا مرے رستے میں نہ آیا ہوتا

ٹوٹنا اور بکھرنا تو مقدّر تھا مرا
کاش تو نے مجھے جوڑے میں لگایا ہوتا

نام جس کا میں درختوں پہ لکھا کرتا تھا
کاش ملنے وہ کبھی خواب میں آیا ہوتا

وسعتِ دامنِ صحرا پہ میں چھا جاتا اگر
اپنے ہاتھوں سے مجھے اس نے جلایا ہوتا

خود بھی رُسوا ہوا اور مجھ کو بھی بدنام کیا
میں ترا راز تھا، سینے میں چھپایا ہوتا

جنسِ نایاب ہوں، رستے میں پڑا ہوں اختؔر
ڈھونڈنے کوئی تو مجھ کو یہاں آیا ہوتا

غزل

اسے منانے کی کوشش تو کی بہت لیکن
زمانہ ہم سے ہمیشہ خفا ہی رہتا ہے

اثر ذرا بھی نہیں ہوتا اس پہ غم کا کبھی
کوئی بھی رُت ہو وہ چہرہ کِھلا ہی رہتا ہے

کبھی نہ پیار کی گرمی سے سنگ پگھلے گا
جو بے وفا ہے، سدا بے وفا ہی رہتا ہے

نہ آیا کوئی ابھی تک مکانِ دل میں مگر
یہ گھر کا در جو کُھلا ہے کھُلا ہی رہتا ہے

غزل

لبوں پر سرخیاں تھیں ، اب کہاں ہیں
ہری سب کھیتیاں تھیں ، اب کہاں ہیں

یہاں اک باغ تھا کچھ روز پہلے!
حسیں کچھ تتلیاں تھیں ، اب کہاں ہیں

کنارے پر گھروندے ریت کے تھے
ندی تھی ، کشتیاں تھیں ، اب کہاں ہیں

چچا کے گھر میں رونق تو بہت تھی
بہو تھی ، بیٹیاں تھیں ، اب کہاں ہیں

خزانہ تھا کبھی دریا میں اختر
گہر تھے ، سیپیاں تھیں ، اب کہاں ہیں

غزل

اپنے اعزاز و تجمل میں نہ کمتر ہوتا
میں اگر دشت نہ ہوتا تو سمندر ہوتا

میں خلاؤں کی بلندی سے بھی واپس آیا
میری آنکھوں میں کوئی دُور کا منظر ہوتا

منزلیں دور ہیں کتنی ، یہ خبر ہی دیتا
میں کہ جامد ہی سہی میل کا پتھر ہوتا

مجھ کو خود اپنے ہی لوگوں نے جلانا چاہا
جل ہی جاتا میں اگر جسم کے اندر ہوتا

دامنِ کوہ سے نکلا ہوا دریا اختؔر
ریگ زاروں میں نہ پھنستا تو سمندر ہوتا

غزل

ورق ورق یہ فسانہ بکھرنے والا تھا
بچالیا مجھے اس نے میں مرنے والا تھا

شگفتہ پھول پریشاں ہوا تو غم نہ کرو
کہ وہ تو یوں بھی ہَوا میں بکھرنے والا تھا

میں اس کو دیکھ کے پھر کچھ نہ دیکھ پاؤں گا
یہ حادثہ بھی مجھی پر گزرنے والا تھا

پہاڑ سینہ سپر ہوگیا تھا میرے لیے
وگرنہ مجھ میں سمندر اُترنے والا تھا

میں بے قصور ہوں یہ فیصلہ ہوا ورنہ
میں اپنے جرم کا اقرار کرنے والا تھا

غزل

تمھیں ارپت یہ میرے شعر میری کلپنا کے ہیں
کہ جیسے آرتی میں پھول یہ آرادھنا کے ہیں

تمھیں میں کیا بتاؤں دل میں میرے زخم کیسے ہیں
حسیں من موہنی مورت کی یہ اِستھاپنا کے ہیں

نرک تم جس کو کہتے ہو، جسے تم سورگ کہتے ہو
میاں یہ سب کرشمے تو ہماری کلپنا کے ہیں

مری غزلوں مری نظموں میں سارے عشق کے قصّے
کسی دلبر کو پانے کی ادھوری کامنا کے ہیں

یہ دنیا ہے یہاں غم اور خوشی میں فرق کرنا کیا
یہ سارے کھیل تو اختؔر ہماری بھاونا کے ہیں

غزل

ستا رہی ہے بہت مچھلیوں کی باس مجھے
بلا رہا ہے سمندر پھر اپنے پاس مجھے

ہوس کا شیشۂ نازک ہوں، پھوٹ جاؤں گا
نہ مار کھینچ کے اس طرح سنگِ یاس مجھے

میں قید میں کبھی دیوار و در کی رہ نہ سکا
نہ آ سکا کبھی شہروں کا رنگ راس مجھے

میں تیرے جسم کے دریا کو پی چکا ہوں بہت
ستا رہی ہے پھر اب کیوں بدن کی پیاس مجھے

گرے گا ٹوٹ کے سر پر یہ آسمان کبھی
ڈرائے رکھتا ہے ہر دم مرا قیاس مجھے

مرے بدن میں چھپا ہے سمندروں کا فسوں
جلا سکے گی بھلا کیا یہ خشک گھاس مجھے

جھلس رہا ہوں میں صدیوں سے غم کے صحرا میں
مگر ہے ابرِ گریزاں کی پھر بھی آس مجھے

منتخب اشعار

محسوس ہو رہا ہے کہ صدیاں گزر گئیں
حالانکہ ہجر یار ابھی کل کی بات ہے

ظلم کا نام زمانے سے مٹانے کے لیے
بڑھ کے خود ہاتھ میں تلوار اُٹھا لو اختر

ہر چند کہ شوکیس میں رکھا ہوں میں اختر
افسوس کہ میں رونقِ بازار نہیں ہوں

دُعا ہے یہ ان کی ہمیں موت آئے
ہم ان کی دُعا میں اثر ڈھونڈتے ہیں

غم نہیں، حائل اگر ہیں راہ میں دُشواریاں
مل ہی جاؤ گے مجھے تم ہے اگر سچی لگن

وہ چہرہ جو دل میں بسا ہے ابھی تک
وہ سورج نہیں ماہ پارا نہیں ہے

قسمت کہاں کہ رہتے حسینوں کے درمیاں
گزری ہے اپنی عمر مشینوں کے درمیاں

پہلے گزروں گا میں امید و یقیں کی رہ یا حد سے
پھر ترا پیار مجھے وہم و گماں بھی دے گا

بچھڑتے وقت وہ رویا لپٹ کے مجھ سے بہت
عجب ستم ہے کہ میں پھر بھی کھل کے رو نہ سکا

ہمیں ہے ناز کہ ہم ہیں پہاڑ کی مانند
ہماری آنکھوں سے چشمے اُبلتے رہتے ہیں

تمھارے واسطے یہ چیز ہے نئی ، ورنہ
یہاں یہ سانپ تو اکثر نکلتے رہتے ہیں

شوخ گفتار ہوئی چلبلے مکتوب ہوئے
بے تکلف وہ ہوئے ہم سے تو پھر خوب ہوئے

رہے شوکیس میں جب تک تو نہ پوچھا ہم کو
اور جب بک گئے ہم تو انھیں مطلوب ہوئے

بس ایک بات تھی کہنے کو اور کچھ بھی نہ تھا
ہم اس کے واسطے طرزِ بیاں بدلتے رہے

گھر کو کاندھے پہ لیے پھرتا ہوں
مجھ میں یہ تاب و تواں ہے اب بھی

میں تعلق سے پرے ہوں لیکن
مجھ سے وابستہ جہاں ہے اب بھی

ہمارے اشکِ محبّت سے اور بھڑکی ہے
یہ آگ وہ ہے کہ جس کو لگا گیا پانی

میں اب یہ شہرِ ہوس چھوڑ کر کہاں جاؤں
مجھے تو راس یہاں کا اب آ گیا پانی

متاعِ درد گراں ہے دیارِ عشق میں اب
اسے خریدلوں اتنا گرہ میں مال کہاں

کربلا ہم نے بھی دیکھی ہے میاں
زندگی کاٹی ہے پیاسوں کی طرح

اب کسی بھی بات پر روتا نہیں!
دل مرا گویا قلندر ہوگیا

پاس تھا جب تو چمک کچھ بھی نہ تھی
دور جاکر وہ تو اختؔر ہوگیا

باب اوّل

احتشام اختؔر

سوانح و شخصیت

آزاد نظمیں

سعیِ رائیگاں

گھٹی گھٹی سی تھی فضا
سڑک بھی کچھ خموش تھی
اندھیرا پھیلنے لگا تھا ہر طرف
گھروں سے جھانکنے لگی تھیں یوں
اُداسیاں
کہ جیسے کوئی مر گیا ہو راہ میں
تھکن سے ٹوٹتا ہوا بدن
پکارتا تھا نیند کو
نظر کی پیاس بڑھ رہی تھی دمبدم
کسی حسین خواب کا یقیں
کبھی کا مر چکا تھا میرے ذہن میں
گماں کی دُھول اُڑ رہی تھی ہر طرف
سمندروں کے پار سے
بلا رہی تھی اک صدا
میں اس صدا سے بھاگ کر
اس اجنبی دیار میں
پناہ لینے آیا تھا

خوابوں کا نگر

خوابوں کے ویران نگر میں
پیار کا عالیشان محل ہے
جس میں اب مکڑی کے جالے
پاگل ہو کر
ناچ رہے ہیں

تعمیرِ نو

موت کے اندھیرے میں اک دیا جلاتا ہوں
منہدم عمارت کو پھر سے میں بناتا ہوں
دل کے ان خرابوں کو پھر سے میں سجاتا ہوں
زلزلے تو آتے ہیں، زلزلے تو آئیں گے
پھر زمین کانپے گی پھر مکان اُجڑیں گے
زلزلے مقدر ہیں وادیِ محبّت کے
زلزلے تو آتے ہیں، زلزلے تو آئیں گے

ایک مرثیہ

(اپنی بہن کے انتقال پر)

شفیق آنکھیں
کہ جن میں میرا ہی عکس اب تک

بسا ہوا تھا
شفیق آنکھیں
کہ دیکھتی تھیں
مری جوانی مرے بڑھاپے کے خواب ہر دم
شفیق آنکھیں کہ جن میں اختر
بسا ہوا تھا
وہ کل — کہ اب جو گزر گیا ہے
وہ کل — کہ جو آنے والا ہے اب
وہ آنکھیں دریا کی تھیں روانی
وہ آنکھیں جھیلوں کی تازگی تھیں
وہ آنکھیں اب کیوں بنی ہیں پتھر
اُداس جھیلوں کی سبز کائی بھی مر نہ جائے
کہ قطرہ قطرہ
ٹپکتی شبنم تو ریگ زاروں میں کھو گئی ہے
حدیں نہ کھینچو رو مال سے تم
کہ میری آنکھیں ندی بنی ہیں
عزیزو مجھ پر کرم یہ کر دو
شفیق آنکھوں میں نور بھر دو

نثری نظمیں

غم

ویران وادی میں
لیٹی ہوئی جھیل کو
غم یہی تھا
کہ اس کے آئینے میں
ماہتاب کا عکس دیکھنے والا
کوئی نہیں

شرارت

دل کا بجھا ہوا دیا
میں نے پھر جلا دیا ہے
ہوا اسے پھر بجھا دے گی
ہوا مجھے ستاتی ہے
میں ہوا کو ستاؤں گا
دل کا بجھا چراغ
میں بار بار جلاؤں گا

ہدایت

روشنی کی کوئی سرحد نہیں
کوئی مذہب نہیں
ہوا کا کوئی جسم نہیں
کوئی ملک نہیں
پانی کا کوئی رنگ نہیں
روشنی کو کوئی نام نہ دو
ہوا کو کوئی جسم نہ دو
پانی کو رنگین نہ بناؤ
پانی میں لہو نہ ملاؤ

مرغولے

تیری یاد
سگریٹ کے مرغولوں کی طرح
حلقہ در حلقہ ٹوٹی ہے
پھر پھیل گئی ہے

شرارتی

خوشی اور غم
میرے دونوں بہن بھائی
بہت شرارتی ہیں

جب بھی میرے گھر آتے ہیں
نہ خط لکھتے ہیں نہ تار دیتے ہیں
بس اچانک آجاتے ہیں
مجھے سرپرائز (Surprise) دینے میں
دونوں کو
مزہ آتا ہے

ترکِ تعلّق

اب چائے ٹھنڈی نہیں ہوگی
داڑھی اب نہیں بڑھے گی
اب قمیص کے بٹن نہیں ٹوٹیں گے
تغافل کسی کا اب نہیں ستائے گا
اب کسی کے انتظار کا غم نہیں رُلائے گا
تھکن اب پیروں سے نہیں اُلجھے گی
فاصلے اب درمیاں نہیں آئیں گے
دل میں اب کوئی خلش نہیں ہوگی
اب دیر تک نیند آئے گی
آفس جانے کے لیے
مجھے اب بیوی جگائے گی

○○

کتابیات

نمبر	نام کتاب	مصنف/مرتب	ناشر/مطبع	سن اشاعت
۱۔	احتشام اختر سے ایک ادبی گفتگو	فوزیہ آصفی	رسالہ ''دلکش'' شمارہ-۲۲-۲۱ ۲۵، ہاتھی تھان، سرونج	-
۲۔	احتشام اختر: جدید شاعری کی معتبر آواز	عبدالمتین جامی	سہ ماہی رسالہ ''رنگ'' شمارہ-۱۵	
۳۔	تذکرہ شعرائے کوٹہ	مرتبہ: عقیل شاداب	راجستھان اُردو اکادمی جے پور	فروری ۲۰۰۰ء
۴۔	تبصرہ ''نیلا آکاش''	مبصر: فاروق بخشی	دو ماہی ''دستخط'' جلد-۱، شمارہ-۱	۱۹۹۹ء
۵۔	تبصرہ ''نیلا آکاش''	مبصر: شاکرہ ناز	''جدید فکروفن'' شملہ جلد-۷، شمارہ-۲۷	۱۹۹۵ء
۶۔	خصوصی مطالعہ احتشام اختر	مدیر: شان بھارتی	ماہنامہ ''رنگ'' شمارہ-۱۲ بجوا، بہار	۱۹۹۹ء
۷۔	خصوصی مطالعہ احتشام اختر	مدیر: شفیق سرونجی	ماہنامہ ''دلکش'' شمارہ-۲۵-۲۲ ہاتھی تھان، سرونج	۱۹۹۹ء
۸۔	راجستھان کی اُردو شاعری کا ارتقائی سفر	ممتاز شکیب	سہ ماہی ''بزمِ فکروفن'' ممبئی جلد-۱، شمارہ-۲۲	۱۹۹۷ء
۹۔	رُوحِ غزل	مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی	انجمن رُوحِ ادب، میورروڈ، الٰہ آباد	۱۹۹۳ء
۱۰۔	راجپوتانہ کے شاعر (سرابوں کے سفیر)	احمد رئیس	ماہنامہ ''قومی زبان'' کراچی جلد-۴۶، شمارہ-۲	۱۹۷۶ء
۱۱۔	راجستھان میں غزل گو شعرا (ایک تعارف)	عبدالحئی	راجستھان اُردو اکادمی جے پور	اگست ۱۹۹۴ء
۱۲۔	راکھ (شعری مجموعہ)	احتشام اختر	مکتبہ ''تحریک'' دریا گنج، نئی دہلی	۱۹۷۴ء
۱۳۔	سرابوں کے سفیر (راجستھان کے شعرا)	احمد رئیس	سہ ماہی ''غالب'' کراچی جلد-۲، شمارہ-۱	۱۹۷۴ء

۱۴۔ سہ ماہی رسالہ ''رنگ'' شمارہ:۲۱واں	مدیر: شان بھارتی راشد انور راشد	جنت ڈیزائننگ اینڈ پبلشنگ، کلکتہ	۲۰۰۲ء
۱۵۔ سرابوں کے سفیر	عقیل شاداب/ کرشن گوپال دادیچ/ظفر غوری	مولانا آزاد لائبریری برج راج پورا، کوٹہ	۱۹۷۱ء
۱۶۔ شاعر (نشری نظم و آزاد غزل نمبر)	افتخار امام صدیقی	مکتبہ قصر الادب، ممبئی	۱۹۹۲ء
۱۷۔ شیرازہ (انتخاب)	مخمور سعیدی پریم گوپال متل	نیشنل اکادمی، دریا گنج، نئی دہلی	-
۱۸۔ صبح کا ستارہ (مجموعہ)	احتشام اختر	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۹۰ء
۱۹۔ ماہنامہ آجکل (۵۰ سالہ انتخاب نمبر)	محبوب الرحمٰن فاروقی	پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی	-
۲۰۔ مونوگراف احتشام اختر	ارشد سراج	راجستھان اُردو اکادمی جے پور	فروری ۱۹۹۴ء
۲۱۔ موجودہ نمائندہ شعرائے اجمیر	سیّد فضل المتین	راجستھان اُردو اکادمی، جے پور	۱۹۹۴ء
۲۲۔ نیلا آکاش (مجموعہ)	احتشام اختر	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۴ء
۲۳۔ نئے زاویے	ڈاکٹر رفعت اختر	نازش بک سینٹر، دہلی	۱۹۹۲ء
۲۴۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کی منتخب شاعری	کمار پاشی	مکتبہ تحریک، دریا گنج، نئی دہلی	۱۹۷۰ء ۱۹۷۱ء

اُردو/ ہندی/ انگریزی رسائل

25. वसुधा, भोपाल सम्कालीन उर्दू साहित्य विशेषांक, सम्पादक : कमला प्रसाद, वाणी प्रकाशन, 21-ए, दरिया गंज, नई दिल्ली, अंक 53 (2002)

26. शेष जोधपुर, अंक 17, फरवरी 2002 तिमाही इन्तखाब, सम्पादक : हसन जमाल

27. **Poetry and Shorty Story Dominate, Azad Gulati, Indian Literature Bimonthly, Issue No. 110, Review 1984-85**

OO

○

بیرون راجستھان کے عظیم شعرا مثلاً غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور داغؔ کے تلامذہ نے راجستھان کے مختلف علاقوں میں نہ صرف سکونت اختیار کی بلکہ اکثر یہیں پیوندِ خاک بھی ہوئے۔ یہاں ان سب کی تفصیل پیش کرنا ہمارا مقصد نہیں، مگر اس جانب اشارہ ضروری ہے کہ راجستھان میں اُردو شاعری کے فروغ میں ان شعرا کے تلامذہ نے غیر معمولی اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ ان شعرا کے اثرات کا ہی نتیجہ ہے کہ جے پور، ٹونک، اجمیر، بیکانیر اور جودھپور وغیرہ مقامات پر شعر و ادب کا جو سلسلہ ۱۹ ویں صدی کے نصف اوّل میں شروع ہوا وہ آج تک برقرار ہے۔ فکر و فن کی سطح پر اس میں وہ خوبیاں بھی موجود ہیں جو آج ملک کے دوسرے علاقوں میں تخلیق ہونے والے ادب میں پائی جاتی ہیں۔ فی الحال راجستھان کے مذکورہ بالا مقامات پر تخلیق ہونے والے ادب کے جائزے سے قطع نظر ہم اس باب میں کوٹہ شہر کے نئی نسل کے شعرا میں ایک خاص مقام رکھنے والے احتشام اختؔر کی حیات و شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کریں گے۔

احتشام اختؔر کا شمار راجستھان کے اُن جدید شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے آزادی کے بعد یہاں کی شعری روایت کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ ان کا اصل نام احتشام اختؔر پاشا ہے اور تخلص اختؔر، لیکن سرکاری کاغذات میں ان کا نام صرف احتشام پاشا درج ہے۔ پیارے میاں ان کی عرفیت ہے اور عرفیت سے عموماً وہی لوگ

واقف ہیں جو احتشام اختؔر کے بہت قریب اور ان کے راز داں ہیں۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ احتشام اختؔر کا تعلق یو۔ پی۔ سے ہے اور وہ وہیں پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ وہ راجستھان کے شہر اجمیر شریف میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا بچپن گزرا۔ اس مغالطے کی اصل وجہ ان کی بات چیت کرنے کا انداز ہے۔ وہ جس طرح دھیرے دھیرے اور رُک رُک کر الفاظ کی کامل ادائیگی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں وہ لہجہ اور انداز عموماً یو۔ پی والوں کا سا ہی ہے۔ علی گڑھ میں ان کے استاد ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب ان کے اس انداز کے بارے میں لکھتے ہیں:

''.....وہ رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے ہیں گویا جب وہ زبان کھولتے ہیں تو ایک ایک نکتے اور ایک ایک پہلو پر غور کر لیتے ہیں۔''

(تبصرہ ''نیلا آکاش'' درج ''صبح کا ستارہ'' ص ۱۰۹، مطبوعہ ''قرطاس'' ناگپور)

بہر حال یو۔ پی۔ انھیں بہت عزیز ہے اور خاص طور سے علی گڑھ سے انھیں جذباتی لگاؤ ہے۔ علی گڑھ انھیں اتنا عزیز ہے کہ کوٹہ میں لیکچرر ہو جانے کے بعد ابتدا میں لمبی رخصت وہ علی گڑھ جا کر گزارتے تھے اور یہ سلسلہ ان کی شادی کے بعد ختم ہوا۔

ایک قطعہ میں انھوں نے علی گڑھ سے اپنے جذباتی رشتے کی وضاحت کچھ اس انداز میں کی ہے:

وہ ماں باپ کی طرح میرے لیے ہے
سدا اس کا سر پر مرے ہاتھ ہوگا

میں ہندوستاں میں کہیں بھی رہوں اب
علی گڑھ ہی یارو مرے ساتھ ہوگا

علی گڑھ سے انھیں اتنا لگاؤ اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم وہیں سے حاصل کی ہے۔

احتشام اختؔر کے والد کا نام احمد حسین پاشا تھا۔ وہ فاروقی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ پاشا کا لقب انھوں نے بعد میں اختیار کیا تھا۔ اور اس کے پیچھے ایک واقعہ یہ ہے کہ احمد حسین مرحوم فوج میں ملازمت کرتے تھے، اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہندوستان سے باہر بصرہ اور ترکی تک گئے تھے۔ ترکی میں انھیں ''پاشا'' کا لقب بہت پسند آیا اور انھوں نے اسے اپنے نام کا ایک حصّہ بنالیا۔ ترکی میں لفظ ''پاشا'' معزّز شخص اور اعلیٰ عہدے دار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعد میں احمد حسین صاحب نے پاشا کا لقب اپنی اولاد کے نام کے ساتھ بھی شامل کر دیا۔ اس طرح سرکاری کاغذات میں احتشام اختؔر کا احتشام پاشا کے نام سے اندراج ہے اور اب تعلیمی اور سرکاری حلقوں میں وہ اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔

احتشام اختؔر کے والد احمد حسین پاشا بعد میں فوج کی ملازمت سے الگ ہو گئے تھے، اور انھوں نے ریلوے میں ملازمت کر لی تھی اور ایک عرصے تک ریلوے گارڈ کے عہدے پر فائز رہے لیکن بعد میں انھوں نے یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور محکمۂ آبکاری میں ملازم ہو گئے اور Excise Inspector کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ جب وہ ملازمت میں تھے تو اس درمیان انھیں ملازمت کے سلسلہ میں سورت بھی رہنا پڑا تھا اور اسی وجہ سے احتشام اختؔر کے بچپن کا کچھ عرصہ سورت اور گجرات میں بھی گزرا۔

احتشام اختؔر کے والدِ مرحوم کی جائے پیدائش احمد آباد ہے اور ان کی پہلی شادی وہیں ہوئی تھی۔ ان کی پہلی بیگم کا نام حسینہ بیگم تھا جن سے دو اولادیں ہوئیں۔ اقبال حسین اور رحیم النساء۔ ان کی دوسری بیوی کا نام حیات النساء تھا۔ ان سے بھی دو

اولادیں ہوئیں۔اس کے بعد انھوں نے عائشہ بیگم سے نکاح کرلیا۔یہ بیوہ تھیں۔ان کے ایک لڑکی ہوئی زلیخا بی بی۔ان کی چوتھی بیگم کا نام آمنہ بی بی تھا۔یہ بھی ایک بیوہ تھیں۔لیکن ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی کیونکہ یہ بانجھ تھیں۔ان کی آخری بیوی امتہ البتول بیگم تھیں جو چشتیہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔بڑا بیٹا تو زندہ نہیں رہا؛البتہ دوسرا بیٹا یہی احتشام اختؔر ہیں جو آج راجستھان کے ممتاز شعرا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

احتشام اختؔر کی والدہ امتہ البتول بیگم سے احمد حسین پاشا کی شادی کا واقعہ بھی کچھ اس طرح ہے کہ احمد حسین پاشا خواجہ غریب نواز کے بے حد عقیدت مند تھے،اور ہر سال اجمیر شریف جایا کرتے تھے۔احتشام اختؔر کے نانا پیرزادہ سیّد قمرالدین مرحوم کے یہاں احمد حسین اکثر قیام کرتے تھے۔قمرالدین صاحب پیشے سے حکیم تھے اور خواجہ غریب نواز کی اولاد میں سے تھے۔ان کے تین اولادیں ہوئیں پیرزادہ سیّد علم الدین علیمی اور چھوٹے لڑکے پیرزادہ سیّد امین الدین چشتی اور سب سے بڑی صاحبزادی امتہ البتول بیگم۔حکیم قمرالدین صاحب کو اپنی بیٹی کی شادی کی بڑی فکر تھی کیونکہ ان کی عمر ہو چکی تھی اور وہ کسی شریف اور معزز خاندان میں ان کا نکاح کرنا چاہتے تھے لہٰذا انھیں احمد حسین پاشا سے بہتر کوئی شخص نظر نہیں آیا اور انھوں نے اپنی لڑکی کی شادی ان کے ساتھ کردی۔

احتشام اختؔر ابھی پانچ برس کے ہی تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور اس کم عمری میں ماں کی ممتا سے محروم ہو گئے۔اور وہ جب تقریباً ۱۵ برس کے تھے تب شفقتِ پدری سے بھی محروم ہو گئے۔والد ماجد کے انتقال کے بعد ان کے ماموں پیرزادہ علم الدین علیمی صاحب نے احتشام اختؔر کی سرپرستی کی اور ان کی پرورش کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔وہ انھیں اپنے ساتھ اجمیر لے آئے اور وہیں ان کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ احتشام اختؔر کی زندگی میں ان کے ماموں کا اہم کردار رہا ہے۔اور بقول احتشام اختؔر:

''ماموں حضرت علیمی اجمیری اپنے سایۂ عاطفت میں میری پرورش نہ کرتے اور مجھے زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ کرتے تو میری زندگی کی ڈگر کچھ اور ہوتی۔'' (ماخوذ از مونوگراف راجستھان اُردو اکادمی جے پور۔ مرتبہ ارشد سراج ص-۳)

احتشام اختر کے ماموں علیمی صاحب کی شادی خود احتشام اختر کی والدہ مرحومہ نے ہی کروائی تھی۔ ان کی مومانی یعنی علیمی صاحب کی بیوی کا نام آمنہ بیگم تھا اور یہ جودھپور کی رہنے والی تھیں۔ شادی کے بعد کافی عرصے تک ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے انھوں نے احتشام اختر کو گود لے لیا تھا اور احتشام اختر کو گود لینے کے کچھ عرصے بعد ہی ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور اس کے بعد ان کے یہاں چار اولادیں پیدا ہوئیں۔ جن میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ پہلے لڑکے کا نام سیّد زین العابدین ہے اور یہ حیات ہیں اور خواجہ غریب نواز کے موجودہ سجادہ نشین ہیں۔ دوسرے لڑکے کا نام سیّد علاؤالدین ہے اور یہ بھی حیات ہیں۔ دو لڑکیاں سیدہ سلطان اور معینہ سلطان تھیں۔ ان دونوں کا انتقال کنوارپن میں ہی ہو گیا۔

احتشام اختر کے ماموں سیّد علم الدین علیمی صاحب ایک اچھے تعلیم یافتہ انسان تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ کالج اجمیر سے حاصل کی اور وہیں سے B.Sc. کیا۔ وہ اس کالج کے مشہور سائنس گریجویٹ طالب علموں میں سے تھے۔ سائنس کے طالب علم ہونے کے باوجود فارسی اور اُردو کے بھی عالم تھے اور اسی کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اپنا کیریئر راشننگ انسپکٹر کی حیثیت سے شروع کیا۔ راشننگ کا محکمہ ٹوٹنے کے بعد وہ محکمۂ سول سپلائی (Deptt. of Civil Supply) میں آ گئے اور آگے ترقی کر کے (Assistant District Supply Officer) کے عہدے تک پہنچے۔ اس عہدے سے ہی وہ ریٹائر ہوئے، اور بعد میں خواجہ غریب نواز کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ علیمی صاحب بہت اچھے شاعر بھی تھے اور

علیمی تخلص کرتے تھے۔

احتشام اختر اپنے ماموں کے سایۂ عاطفت میں پلے بڑھے۔ اُن کی زیرِ نگرانی احتشام اختر کی تعلیم کا سلسلہ مزید آگے بڑھا۔ حالانکہ اس درمیان انھیں کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس بات کا اندازہ تو ہر شخص یقیناً لگا سکتا ہے کہ اس انسان کو کتنی مشکل راہوں سے گزرنا پڑا ہوگا جس کے والدین کم عمری میں ہی گذر جائیں، والدین کی کمی تو ہر عمر میں محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال چونکہ علیمی صاحب نے احتشام اختر کو پہلے ہی گود لے لیا تھا اس لیے احتشام اختر صاحب نے اپنی مومانی کو ہی اپنی ماں سمجھا اور انھیں مومانی نہ کہہ کر امّی کہا۔ لیکن بعد میں جب اُن کے خود اولادیں ہوئیں تو ان کی محبت میں کمی آگئی، اور اُن کی توجہ اپنی اولاد کی طرف زیادہ اور احتشام اختر کی طرف کم ہوگئی۔ وہ احتشام اختر کو زیادہ تعلیم دلانے کے حق میں بھی نہیں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد یہ کسی بھی طرح کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرلیں تاکہ ان کی ملازمت سے گھر کی معاشی پریشانیاں دور ہوسکیں۔ علیمی صاحب ایک ایماندار سرکاری ملازم تھے اور رشوت لینا گناہ سمجھتے تھے۔ آمدنی ان کی محدود تھی اور افراد زیادہ تھے۔ اس لیے عسرت میں دن گذرتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مومانی چاہتی تھیں کہ احتشام اختر کوئی ملازمت کرلیں لیکن علیمی صاحب احتشام اختر کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بیوی کی ایک بات نہ مانی اور جیسے تیسے کرکے انھیں بی۔ اے۔ تک پڑھایا۔ احتشام اختر بھی خوددار تھے اور اس بات کو محسوس کرتے تھے، اس لیے وہ طالب علمی کے زمانے میں ہی ٹیوشن کرنے لگے تھے اور بچوں کو پڑھانے دور دراز تک جایا کرتے تھے۔ اس سے ان کی معاشی پریشانیاں کسی حد تک کم ہوئیں۔ آخر بی۔ اے کرنے کے بعد خود احتشام اختر کو ملازمت کی تلاش ہوئی۔ حالانکہ ان کی دلی خواہش اُردو کا لیکچرار بننے کی تھی۔ بہر حال اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ کر انھوں نے کوشش کی کہ انھیں کوئی معقول ملازمت مل جائے۔ چنانچہ انھوں نے اجمیر کی درگاہ

MODERN PUBLISHING HOUSE
9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-23278869

EHTESHAM AKHTAR KI SHERI KHIDMAAT : EK JAIZA

By: **Anjum Afaque**

Year 2004
Rs. 150/-

آفس میں نوکری کے لیے درخواست پیش کی اور چونکہ احتشام اختر B.A. پاس تھے چنانچہ انھیں عرس کے دوران انکوائری دفتر میں ایک معمولی ملازمت مل گئی اور اس کے بعد انھیں مستقل طور پر درگاہ کے مقدمات کا کام سپرد کر دیا گیا لیکن ان کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اب بھی موجود تھی۔ ملازمت تو انھوں نے کچھ مجبوریوں کے تحت کی تھی لیکن تعلیم حاصل کرنے کا شوق انھیں شروع سے تھا۔ چونکہ احتشام اختر طالبِ علمی کے زمانے سے ہی رسالوں میں لکھنے لگے تھے اور پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ اخبار ''ہماری زبان'' میں ان کی تخلیقات چھپتی تھیں، اس طرح سرور صاحب احتشام اختر سے متعارف تھے۔ اس دوران سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ بی۔ اے میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے کی وجہ سے حکومتِ راجستھان کے محکمۂ تعلیم نے ان کا نام وظیفے کے لیے منتخب کیا اور احتشام اختر کو لکھا کہ اگر وہ کہیں داخلہ لینا چاہتے ہیں تو ہر ماہ انھیں میرٹ اسکالرشپ دی جائے گی۔ مگر بدقسمتی سے یہ خط احتشام اختر کو دیر سے ملا۔ داخلے کا وقت نکل چکا تھا۔ لیکن وظیفے کی اطلاع پا کر احتشام اختر کو بے حد خوشی ہوئی اور ان کے دل میں دوبارہ یہ خواہش بیدار ہوئی کہ وہ اُردو میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کالج میں پھر سے داخلہ لیں۔ چونکہ راجستھان میں اس وقت کہیں بھی اُردو میں ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے انھوں نے مجبوراً آلِ احمد سرور صاحب کو خط لکھا اور ان سے رہنمائی اور مدد کی درخواست کی۔ سرور صاحب نے نہ صرف خط کا جواب دیا بلکہ احتشام اختر کی حوصلہ افزائی بھی کی اور فوراً علی گڑھ آنے کے لیے کہا۔ احتشام اختر علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے صرف میرٹ اسکالر شپ کے سہارے ہی جا سکتے تھے۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ ایک سال کے وقفے کے بعد یہ وظیفہ انھیں مل سکتا ہے یا نہیں اور دوسری اہم بات یہ کہ راجستھان سے باہر داخلہ لینے کے لیے بھی یہ وظیفہ دیا جائے گا یا نہیں۔ چنانچہ اس کے لیے احتشام اختر نے اپنے

کالج کے پروفیسر جناب جے۔ بی۔ ماتھر صاحب سے رجوع کیا اور پروفیسر صاحب نے راجستھان کی منسٹری آف ایجوکیشن سے خط و کتابت کی اور آخر کار ان کی کاوشیں رنگ لائیں اور احتشام اختؔر کو یہ منظوری ملی کہ وظیفہ انھیں دیا جائے گا اور علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے باوجود بھی دیا جائے گا۔ یہ خبر احتشام اختؔر کی زندگی میں نئی خوشیاں لے کر آئی۔ آخر کار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں انھیں داخلہ مل گیا اور اس طرح ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا۔ خود احتشام اختؔر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''پروفیسر آلِ احمد سرورؔ صاحب مجھے علی گڑھ نہ بلاتے اور وہاں میری سرپرستی نہ کرتے تو اُردو لیکچرر بننے کے بجائے آج میرا کیریئر کچھ اور ہی ہوتا۔''

محض تعلیمی نقطۂ نظر سے ہی نہیں بلکہ شاعرانہ ذوق و شوق کے اعتبار سے بھی احتشام اختؔر کا علی گڑھ میں قیام ان کی شعری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں بہت مفید ثابت ہوا۔ علی گڑھ نے ان کی فنی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور وہاں ان کو اپنی شاعری کو پروان چڑھانے کے بہتر مواقع ملے۔ احتشام اختؔر کے اساتذہ میں بھی بیشتر اساتذہ ایسے تھے جن کی حیثیت اُردو ادب میں مسلّم ہے۔ مشہور ادیب اور شاعر اور جید عالموں سے انھیں تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے اساتذہ میں آلِ احمد سرورؔ، مسعود علی ذوقی، قاضی عبدالستار، ڈاکٹر منظر عباس نقوی، ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب، نسیم قریشی، ڈاکٹر نورالحسن نقوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر شہریار، نادر علی خاں، اور نعیم احمد کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام اساتذہ کا تعلق شعبۂ اُردو سے تھا لیکن شعبۂ اُردو سے باہر علی گڑھ کے چند مشاہیرِ ادب سے بھی احتشام اختؔر کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ ان حضرات میں ڈاکٹر وارث کرمانی اور ڈاکٹر وحید اختر

وغیرہ کے اسمائے گرامی بہت نمایاں ہیں۔ ان تمام اساتذہ کی صحبت سے ان کو فیض حاصل ہوا۔ علی گڑھ میں ہی زندگی اور ادب کے باہمی ربط و تعلق کا انھیں پہلی بار احساس ہوا اور وہ ادب کے ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے بہت متاثر ہوئے، خود ایک مقام پر رقم طراز ہیں:

''اپنے طالب علمی کے زمانے میں مجاز اور ساحر لدھیانوی کی شاعری مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں نے اُن کی نظمیں اور غزلیں بارہا پڑھیں ہیں۔ اب بھی فیض اور مجروح کی شاعری اچھی لگتی ہے۔ خاص طور سے وہ نظمیں اور غزلیں جن میں پروپیگنڈا اور خطابت کا عنصر کم ہے۔''

(دلکش سرونج کے شمارہ نمبر ۲۵-۲۲ میں)

احتشام اختر طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ ان کی پہلی غزل ہائی اسکول کے دوران ایک میگزین میں چھپی تھی جس کے ایک شعر کی ان کے ماموں علیمی صاحب نے بے حد تعریف کی تھی۔ وہ شعر یہ تھا:

محسوس ہو رہا ہے کہ صدیاں گذر گئیں
حالانکہ ہجرِ یار ابھی کل کی بات ہے

یہ شعر احتشام اختر کا اپنا شعر تھا کسی کا چربہ نہیں تھا۔ لیکن ان کے ماموں کو اس کا یقین نہیں تھا کہ اتنی کم عمری میں یہ ایسے بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔

ابتدا میں تو احتشام اختر اپنے ماموں سے، یعنی حضرت علیمی اجمیری مرحوم سے ہی اصلاح لیتے تھے۔ لیکن علیمی صاحب روایت پسند شاعر تھے اور کلاسیکیت کے دلدادہ

تھے اس لیے وہ ان کی اصلاح سے زیادہ مطمئن نہیں ہوئے اور بعد میں مطالعہ اور مشاہدہ کو رہنما بنایا۔

احتشام اختؔر کی پہلی نظم علی گڑھ سے پروفیسر آلِ احمد سرورؔ صاحب کی زیرادارت شائع ہونے والے ہفتہ وار ''ہماری زبان'' میں شائع ہوئی تھی۔ان کی پہلی نظم کا عنوان ''تعمیرِ نو'' ہے۔ذیل میں اس نظم کے کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

موت کے اندھیرے میں اِک دِیا جلاتا ہوں
دل کے ان خرابوں کو پھر سے میں سجاتا ہوں

منہدم عمارت کو پھر سے میں بناتا ہوں
زلزلے تو آتے ہیں زلزلے تو آئیں گے
پھر زمین کانپے گی، پھر مکان اُجڑیں گے
زلزلے مقدر ہیں وادیِ محبت کے
زلزلے تو آتے ہیں، زلزلے تو آئیں گے

احتشام اختؔر کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ علی گڑھ سے ایم۔اے۔کر کے اُسی یونیورسٹی میں ملازمت کرلیں اور شعبۂ اُردو میں اُردو کے لیکچرر مقرر ہو جائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا کیونکہ وہاں لیکچرر شپ کے لیے کئی لوگ پہلے سے ہی قطار میں تھے۔مثلاً شمیم حنفی، امیر عارفی، اصغر عباس اور بشیر بدر وغیرہ۔آلِ احمد سرورؔ صاحب کے زیرِ نگرانی احتشام اختؔر نے ''اُردو نظم میں ہیئت کے تجربے'' کے موضوع پر چند سال تحقیقی کام کیا لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور اس دوران راجستھان پبلک سروس کمیشن نے اُردو لیکچرر کے لیے درخواستیں طلب کیں۔اختؔر صاحب نے اپنی بھی درخواست یہاں بھیج دی اور

۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج کوٹہ میں اُردو لیکچرر کے عہدے پر ان کا تقرر ہو گیا۔

لیکچرر شپ ملنے تک احتشام اختر کے ماموں اور موما نی کا انتقال ہو چکا تھا، اور والدین کا سایہ تو بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ اس لیے کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو کہ ان کی شادی وغیرہ کے متعلق غور کرتا اور ان کی شادی کرواتا۔ البتہ اُن کے دور کے رشتے کی ایک موما نی ضرور تھیں جو اکثر احتشام اختر کی توجہ اس طرف دلاتی تھیں اور اکثر کہتی تھیں کہ تم کوٹہ میں اکیلے ہوٹل میں رہتے ہو، اب تم برسرِ روزگار بھی ہو گئے ہو اس لیے اب تمھیں شادی کر کے گھر بسالینا چاہیے۔ اور پھر شادی شدہ آدمی کو سماج میں اعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی موما نی کا تعلق نیا ہیڑا، چتوڑ سے تھا اور وہاں ان کی جان پہچان میں ایک مشہور وکیل تھے جن کی دختر قیصر جہاں انھیں احتشام اختر کے لیے بالکل معقول نظر آئیں۔ احتشام اختر خود بھی ایک گھریلو قسم کی لڑکی پسند کرتے تھے اور خاص طور سے یہ کہ وہ ملازمت نہ کرتی ہو۔ چنانچہ یہ رشتہ احتشام اختر کو معقول نظر آیا اور خود ان کے خسر وکیل عبدالحکیم صاحب نے بھی ان کی شخصیت اور مزاج کو پسند کیا تھا۔ عبدالحکیم صاحب ایک قابل وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے اور فرقؔ تخلص کرتے تھے۔ اس لیے احتشام اختر کو پسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ بہر حال یکم جون ۱۹۷۷ء میں ان کی شادی قیصر جہاں کے ساتھ ہو گئی۔ احتشام اختر یہ توقع رکھتے تھے کہ ذہنی رفاقت بھی شریکِ حیات سے حاصل ہو۔ لیکن ان کی بیوی کو ادب یا شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر عادتاً اور مزاجاً وہ ایک بہت اچھی خاتون ہیں۔

علی گڑھ کے سفر میں انھیں ایسے کئی ''ہم سفر'' بھی ملے جن سے انھیں ذہنی رفاقت بھی حاصل ہو سکتی تھی لیکن ان سے رشتۂ ازدواج نہیں ہو سکا۔ احتشام اختر اس سلسلے میں ایک شعر دُہراتے ہیں:

یہاں کسی کو کوئی حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

احتشام اختؔر اولاد کے غم سے کئی عرصے تک پریشان رہے کیونکہ شروع میں کئی اسقاط ہو گئے اور بہت آخر میں ایک لڑکی ۱۹۸۶ء میں پیدا ہوئی جس کا نام عظمیٰ ہے اور جواب بارہویں جماعت میں اپنی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

احتشام اختؔر کو مطالعے کا کافی شوق رہا ہے چنانچہ اُردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی ادب کا انھوں نے براہِ راست مطالعہ کیا ہے۔ دیگر مشاغل میں سیر و سیاحت، فلم بینی اور مصوّری بھی شامل ہیں۔ واٹر کلر میں انھوں نے کئی تصویریں بھی بنائی ہیں۔ لیکن یہ شوق بہت مہنگا ہے اور اس کے لیے ذہنی یکسوئی بھی درکار ہے۔ اس لیے اس آرٹ پر انھوں نے سنجیدگی سے توجہ نہیں کی۔ ان کی اہلیہ کو بھی ہینڈی کرافٹ کا بہت شوق ہے کئی خوبصورت شوپیس ان کی بیوی کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ احتشام اختؔر کو تاش، بیڈمنٹن، اور شطرنج کا بھی شوق ہے۔ لیکن زیادہ وقت وہ اپنی شاعری کو ہی دیتے ہیں۔ کیونکہ بقول خود:

''شاعری میری صرف Hobby ہی نہیں بلکہ میری زندگی کا ایک حصّہ ہے۔''

احتشام اختؔر نے کئی تعلیمی اور تدریسی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ وہ شروع سے فروغِ اُردو کے لیے کوشاں رہے جب ان کا تقرر گورنمنٹ کالج کوٹہ میں ہوا تو کالج میں صرف بی۔ اے تک اُردو تعلیم کا انتظام تھا اور صرف ایک لیکچرر کی آسامی تھی۔ احتشام اختؔر اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے آگے چل کر ۱۹۸۲ء میں کوٹہ کالج میں شعبۂ اُردو میں ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور اس طرح شعبۂ اُردو کی توسیع ہوئی۔ تین

اور لیکچرر کا تقرر کیا گیا۔ احتشام اختر نے شعبۂ اُردو میں ایسوسی ایشن قائم کی اور اس کے زیرِ اہتمام شعری نشستیں اور مذاکرے منعقد کروائے۔ کالج میگزین میں اُردو کا Section بھی شروع کروایا، حالانکہ اس کی کافی مخالفت ہوئی۔ اسی طرح کالج یونین کے سالانہ کلچرل پروگرام میں آل انڈیا مشاعرہ اور اُردو غزل کا مقابلہ اور اُردو ڈبیٹ وغیرہ کو بھی شامل کروایا۔ جب ۱۹۸۶ء میں گورنمنٹ کالج کوٹہ کو آٹونامس کالج کا درجہ دیا گیا تو اس میں اُردو فارسی کا نصابی بورڈ قائم ہوا اور احتشام اختر اس نصابی بورڈ کے Convenor مقرر ہوئے۔ راجستھان یونیورسٹی جے پور اور مہرشی دیانند سرسوتی یونیورسٹی اجمیر کے بھی احتشام اختر رُکن رہے۔ جب ان کا تبادلہ جھالاواڑ کالج میں ہوا تو انھوں نے وہاں بھی اُردو کی ترقی کے کاموں میں خصوصی دلچسپی لی۔ ان کی کوششوں سے گورنمنٹ کالج جھالاواڑ میں اُردو طلبا اور طالبات کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ جھالاواڑ کالج میں بھی اُنھوں نے نظیر اکبر آبادی اور غالب پر سیمینار منعقد کروائے اور اُردو میگزین کا اجرا ہوا۔ جب احتشام اختر اجمیر میں تھے تو وہاں انھوں نے اُردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا۔ جدید قلم کاروں کے تعاون سے اجمیر میں انھوں نے ''انجمن فنکارانِ نو'' کی بنیاد رکھی اس انجمن نے اُردو کی ترقی اور ترویج اور جدید شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ کوٹہ میں بھی انھوں نے ''ہم سخن'' کی بنیاد رکھی اور اس انجمن کے تحت متعدد ادبی تقریبات منعقد کی گئیں۔ اجمیر ان کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے وہاں کے ایک صاحبِ طرز شاعر قابل اجمیری سے انھیں جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے قابل اجمیری پر ایک مونوگراف لکھا اور اُسے راجستھان اُردو اکادمی نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اُردو کے فروغ کے لیے احتشام اختر نے مضامین بھی لکھے اور گجرال کمیٹی کو بھی اپنی سفارشات بھیجیں۔ جب گجرال صاحب اور بیگم حامدہ حبیب اللہ اور دیگر ممبران جے پور آئے اور یہاں سکریٹریٹ میں گجرال کمیٹی کی Meeting ہوئی تو احتشام اختر کو راجستھان میں اُردو کے خصوصی نمائندے کے

طور پر مدعو کیا گیا۔ احتشام اختؔر کی ادبی اور علمی خدمات کا اعتراف متعدد اداروں نے کیا ہے۔ چنانچہ راجستھان اُردو اکادمی نے ۲۰۰۰ء-۱۹۹۹ء کا بسمل سعیدی ایوارڈ دیا۔ یہ ایوارڈ راجستھان کے وزیرِ اعلیٰ جناب اشوک گہلوت کے دستِ مبارک سے دیا گیا۔ یہ ایوارڈ احتشام اختؔر کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ راجستھان اُردو اکادمی نے ان کی شاعری اور شخصیت کے متعلق ایک مونوگراف بھی شائع کیا ہے۔ لائنس کلب کوٹہ نے بھی آپ کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے آپ کو سندِ توصیف اور شال پیش کی۔ اسی طرح بزمِ ادب کوٹہ اور ''شری بھارتیندو سمیتی'' نے بھی اعزاز دیا۔ بھارتیندو سمیتی نے ناگری رسم الخط میں ایک مونوگراف بھی شائع کیا ہے۔ احتشام اختؔر نے گورنمنٹ کالج جھالاواڑ میں ۲۰۰۲ء فروری میں جنگِ آزادی میں اُردو کے حصّے کے موضوع پر یو۔ جی۔ سی کے تعاون سے Extension Lectures بھی منعقد کروائے۔

جب ہم احتشام اختؔر کی سیرت و شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف اشخاص نے ان کی سیرت و شخصیت کا مختلف طریقوں سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً فضل المتین صاحب نے ''موجودہ و نمائندہ شعرائے اجمیر'' میں لکھا ہے کہ:

> ''احتشام اختؔر نمکین رنگت تیکھے نقوش کے دھان پان اور زود رنج اور حساس انسان ہیں۔'' (''موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر'' مرتب فضل المتین)

اسی طرح ان کے ہم عصر شاعر عقیل شاداب صاحب، جو خود بھی مشہور اور نامور شاعر ہیں انھوں نے تذکرہ شعرائے کوٹہ میں لکھا ہے:

> ''قد مائل بہ فراز، رنگ گندمی، ناک لمبی، آنکھیں خوبصورت، چہرہ کتابی

اور آواز پُر اثر ہے۔'' (''تذکرہ شعرائے کوٹہ'' مرتبہ عقیل شاداب ص ۵۱)

علی گڑھ میں ان کے استاد ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب نے بھی ان کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> احتشام طالبِ علمی کے زمانے میں بھی کم آمیز اور کم سخن تھے، اور اب بھی ویسے ہی ہیں۔ لیکن مغرور یا برخود غلط نہ وہ جب تھے نہ اب ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا طبعاً کم گو ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ یا وہ گوئی ان کے بس کا روگ نہیں ہے.....''

(تبصرہ ''نیلا آکاش'' مطبوعہ قرطاس ناگپور، جولائی-اگست ۱۹۸۶ء، جلد نمبر-۳، شمارہ-۶)

پچھلے صفحات میں، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ احتشام اختؔر کو بچپن سے ہی شعر و ادب کا شوق تھا چنانچہ اسی وجہ سے شعر و شاعری ان کی زندگی کا ایک اہم حصّہ بن گئی۔ جدید شاعری میں احتشام اختؔر شکیبؔ جلالی، ظفؔر اقبال اور اختر الایمان سے متاثر ہیں اور قدیم شاعروں میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری سے خصوصی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ یہاں ہم اس جانب بھی متوجہ کرنا چاہیں گے کہ احتشام اختؔر نے اُس وقت جدید رنگ اختیار کیا جب راجستھان میں روایتی شاعری کا بول بالا تھا۔ یہاں کے نوجوان اور نوآموزِ سخن عموماً ترقی پسند شاعری کو ہی جدید شاعری سمجھتے تھے اور کیفؔی اعظمی اور سردار جعفری ان کے خیال میں جدیدیت کے علم بردار تھے۔ راجستھان کے نوجوان شعرا نے ناصؔر کاظمی، شکیبؔ جلالی، اور ظفؔر اقبال کا نام تک نہیں سنا تھا۔ جن لوگوں نے راجستھان میں جدیدیت کی شمع روشن کی، ان میں احتشام اختؔر کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے جدیدیت کے اصل مفہوم کو سمجھا اور شعری سطح پر اسے بامعنی

بنانے کی سعی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ احتشام اختؔر اپنی سوچ کے تنہا شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے جذبے میں فکر کو شامل کیا اور اسی طرح اپنے شعروں میں تہہ داری بھی پیدا کی۔ انھوں نے ایک منفرد اسلوب اختیار کیا ہے اور اسی لیے ہم انھیں راجستھان کا ایک منفرد صاحب طرز شاعر کہہ سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا سطور میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ احتشام اختؔر نے جدیدیت کی طرف اس وقت رُخ کیا جب یہاں روایتی شاعری کا بول بالا تھا تو ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ احتشام اختؔر کی شاعری جدید شاعری کی تمام شرائط پر پوری اُترتی ہے مگر ہم ان کی شاعری کو جدید دور کی ناہمواریوں تک ہی محدود نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ ان کے یہاں روایتی موضوعات کا بھی بیان ملتا ہے۔ ان کی اس خوبی پر غور کرتے ہوئے عبدالمتین جامی صاحب لکھتے ہیں:

> ''موصوف کے یہاں جس طرح عہدِ جدید کی تمام ناہمواریوں کا بیان ملتا ہے اسی طرح محبوب کے فراق اور وصال جیسے روایتی موضوعات کا بھی خلاّقانہ بیان نظر آتا ہے۔ غالباً اس طرح انھوں نے اپنی شاعری کو یکسانیت کے الزام سے بچانے کی سعی کی ہے۔''

(سہ ماہی ''رنگ'' ص ۳۳ - شمارہ ۱۵ جوا، دھنباد)

عبدالمتین جامی کا یہ قول بالکل درست ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں ان کے شعری مجموعوں میں بہ آسانی مل جاتا ہے۔ ان کے اب تک تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا سب سے پہلا شعری مجموعہ ''راکھ'' ہے جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ان کی غزلیں اور نظمیں موجود ہیں۔ اس میں نثری نظموں اور آزاد نظموں کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ ''راکھ'' پر رائے دیتے ہوئے رشید افروز ایک تبصرے میں لکھتے ہیں:

احتشام اختر کی شعری خدمات

—— ایک جائزہ

انجم آفاق

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ - گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی -۱۱۰۰۰۲

''.....تمھارا مجموعۂ کلام 'راکھ' ادبی حلقوں میں تمھاری شاعرانہ حیثیت کو مستحکم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔''

(تبصرہ ''راکھ'' درج ''نیلا آکاش'' مرتبہ احتشام اختر ص ۱۰۹)

احتشام اختر کا دوسرا شعری مجموعہ ''نیلا آکاش'' کے نام سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا، یہ ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔ نثری نظم کے تعلق سے راجستھان کے اولین نظم نگاروں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ احتشام اختر نے بہت خوبصورت نثری نظمیں لکھیں ہیں۔ اہلِ نظر نے ان کی نظموں کو خوب خوب سراہا ہے۔ ان کی نظمیں ایجاز و اختصار کا پُر لطف نمونہ ہیں۔ زبان عام فہم ہے اور بول چال کی زبان استعمال کی گئی ہے جو نثری نظموں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ ان کی نظم ''لاحاصلی'' کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

''قطار اندر قطار
انتظار
بے وزن زندگی میں قافیوں کی بھرمار
لاحاصلی کا کیا شمار
سب بے کار
سب بے کار

احتشام اختر نے اپنی زندگی میں اب تک تین کامیاب شعری مجموعے ترتیب دیے ہیں۔ ان کا تیسرا اور آخری شعری مجموعۂ کلام ''صبح کا ستارہ'' ہے جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ خالص غزلوں کا مجموعہ ہے۔

رومانی معاملات اور وارداتِ قلبی ہمیشہ سے اُردو شاعری کا، بالخصوص غزل کا

بنیادی موضوع رہے ہیں اور بڑے سے بڑے اور ہر چھوٹے سے چھوٹے شاعر نے اپنے جذبات واحساسات کا بیان غزلیہ شاعری میں کیا ہے۔ احتشام اختؔر کے کلام میں بھی 'دیدہ و دل' کا یہ انداز موجود ہے۔ ان کے اشعار بھی محبت کے نازک رشتوں اور دل کے جذبات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

نظم وغزل کے علاوہ احتشام اختؔر نے مضامین اور افسانے بھی لکھے ہیں جو موقر ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ احتشام اختؔر اُردو کے علاوہ ہندی جرائد اور اخبارات میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کا کلام آل انڈیا ریڈیو دہلی اور آکاش وانی جے پور سے نشر ہوتا رہا ہے۔

غرض یہ کہ موجودہ دور میں راجستھان کے جدید شعرا کی فہرست میں احتشام اختؔر کا نام ہمیشہ روشن ستارے کی طرح چمکتا اور جگمگاتا رہے گا۔

OO

باب دوم

احتشام اختؔر

اور اُن کے معاصرین

○

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروحؔ سلطان پوری کا مذکورہ بالا شعر اس بات کی طرف صاف اشارہ ہے کہ کوئی بھی شاعر یا ادیب جب اپنی شاعری کی ابتدا کرتا ہے تو اس کے زمانے کے سیاسی و سماجی حالات، اس کے خاندانی یا ذاتی حالات اور اس کے معاصرین شعرا کا اثر بھی اس کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ہر دور میں متعدد شعرا اور ادبا گزرے ہیں اور یہ مثال کہیں نہیں ملے گی کہ کسی دور میں صرف ایک ہی شاعر گزرا ہو۔ ہاں یہ بھی غور طلب ہے کہ غیر معمولی شہرت ہر کسی کے حصّے میں نہیں آتی۔ جب ہم کسی شاعر یا ادیب کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے ساتھ اس کے معاصرین یا ہم عصر شعرا کا تذکرہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ پیشِ نظر باب میں ہم احتشام اخؔتر کے بعض اہم ہم عصر شعرا کا تذکرہ کریں گے تاکہ تقابلی مطالعے سے احتشام اخؔتر کے شعری کردار کا مطالعہ بہتر طور پر ممکن ہو سکے۔

پچھلے باب میں اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ احتشام اخؔتر کی زندگی مختلف شہروں میں گذری ہے۔ کسی ایک جگہ مستقل ان کا قیام نہیں رہا ہے مگر ملازمت کے بعد اب وہ کوٹہ میں ایک طویل عرصے سے مقیم ہیں اور اب کوٹہ ہی ان کا وطنِ ثانی بن چکا

ہے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ راجستھان کے مختلف شہروں میں قیام کر چکے ہیں۔ اس لیے کچھ نقاد انھیں ''خانہ بدوش'' شاعر بھی کہتے ہیں۔ ان کی شاعری سے بھی ان کی خانہ بدوشی کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ:

گھر کو کاندھے پہ لیے پھرتا ہوں
مجھ میں یہ تاب و تواں ہے اب بھی

ایک دوسرے شعر میں اسی خیال کو اس طرح پیش کیا ہے:

پنچھیوں کا بھی ٹھکانا ہے میاں اس شہر میں
ایک اپنا ہی نہیں ہے بس مکاں اس شہر میں

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو احتشام اختر کے معاصرین کی تعداد مختلف شہروں کے تعلق سے زیادہ ہے، یعنی مختلف شہروں میں ان کے معاصرین پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً احتشام اختر کی زندگی کے ایام اجمیر، سورت، احمد آباد، علی گڑھ، نیما ہیڑا ضلع چتوڑ، جھالاواڑ اور کوٹہ میں گزرے ہیں اور ہر شہر میں ان کے معاصرین مل جائیں گے۔ لیکن جن شعرا سے ان کی قربت رہی وہ معدودے چند ہیں جن میں ایک طرف بزرگ شعرا علیمی اجمیری مرحوم، سیّد فضل المتین، اعجاز اجمیری، موہن سروپ سیرت اجمیری ہیں تو دوسری طرف ممتاز راشد، منّان راہی، رام لال ندیم، احمد رئیس، شہاب عراقی، مرزا خلیل بیگ، اعجاز عبید، صلاح الدین پرویز، منظور ہاشمی، غلام مرتضیٰ راہی اور کافی سینئر شعرا میں بشیر بدر، وغیرہ سے بھی ان کی ملاقاتیں رہیں۔

اساتذہ شعرا میں آلِ احمد سرور، معین احسن جذبی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر شہریار، ڈاکٹر وارث کرمانی، اور ڈاکٹر وحید اختر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے

علاوہ ہم جماعت اور ریسرچ اسکالر میں قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر شمیم حنفی، فوق کریمی مرحوم، ڈاکٹر اصغر عباس، ڈاکٹر امیر عارفی، شمیم نوید، عرشی علی گڑھی، جمنا پرساد راہی، نازش انصاری مرحوم، ابنِ فرید مرحوم اور صبا جائسی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان سب کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے رہا ہے۔ جہاں سے احتشام اختر نے اپنی ایم۔ اے اُردو کی تعلیم مکمل کی تھی۔

کوٹہ میں بھی ان کے ہم عصر شعرا میں مائل سعیدی مرحوم، مفتوں کوٹوی، ڈم ڈم کوٹوی، عمر کوٹوی مرحوم، ظفر غوری مرحوم، ظفر احمد پرواز، عقیل شاداب وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بہر حال احتشام اختر کے ہم عصر شعرا کا یہ مختصر سا جائزہ تھا ذیل میں ہم اس جانب تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

احتشام اختر کی جائے پیدائش اجمیر ہے اور بی۔ اے تک انھوں نے اپنی تعلیم اسی شہر میں حاصل کی۔ جیسا کہ پہلے باب میں ذکر آیا ہے، احتشام اختر کے ماموں خود بھی ایک اچھے شاعر تھے اور اُردو، فارسی اور انگریزی کے جید عالم تھے۔ ان کا نام سیّد علم الدین اور علیمی تخلص تھا۔ ان کا شمار اجمیر کے معتبر اور تعلیم یافتہ شعرا میں ہوتا ہے۔ اجمیر کے استاد شاعر عرشی اجمیری مرحوم کے وہ شاگرد تھے۔ علیمی صاحب کے نمونۂ کلام کے طور پر چند اشعار پیش کرتی ہوں ملاحظہ فرمائیں:

تمام جس پہ تھیں ناکامیاں زمانے کی
وہ ابتدا تھی غمِ عشق کے فسانے کی

چراغِ راہ گزر ہوں بھڑک نہ جاؤں کہیں
ہَوا کے جھونکے نہ کوشش کریں بجھانے کی

روئے تاباں پہ ڈھلک آئیں اگر وہ گیسو
ایک ہو جائیں گے دونوں سحر و شام ابھی

تو ملے یا نہ ملے راہِ طلب میں تیری
اتنا بڑھ جاؤں کہ پھر لوٹ کے آ بھی نہ سکوں

علیمی صاحب نے غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ نظموں میں وہ اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مختلف رسائل اور گلدستوں میں ان کا کلام شائع ہو چکا ہے، لیکن افسوس کہ ان کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہو سکا۔

ایک اور بزرگ شاعر جن سے اجمیر میں احتشام اختر کا تعلق رہا وہ ہیں سیّد فضل المتین۔ یہ معنی اجمیری کے حقیقی برادر زادے ہیں۔ علم و ادب کا شوق انھیں وراثت میں ملا ہے۔ نظم و نثر دونوں میں لکھتے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی اودے پور نے ان کا شعری مجموعہ ''کلام'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ بارگاہ اور نخلستان جیسے رسائل کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ قابل اجمیری کا انتخابِ کلام بھی مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ جسے راجستھان اُردو اکادمی نے شائع کیا تھا۔

''موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر'' سیّد فضل المتین کا ایک عدیم النظیر ادبی کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ۱۹ شعرا کا انتخاب کیا ہے جس میں اُن شعرا کا انتخابِ کلام، سوانحی اشارے وغیرہ درج ہیں۔ ان ۱۹ شعرا میں مولانا خنداں، سلطان احمد، اُفق اجمیری، احمد رئیس، ممتاز راشد، احتشام اختر، جمیل قریشی، میکش اجمیری، حضرت اعجاز اجمیری، سیّد فضل المتین خود اور امتیاز علی، خورشید، منان راہی، رام لال ندیم، حافظ قمر، صادق راز، غیاث الدین غیاث، ناظم الدین ناظم اور موہن سروپ سیرت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر ان کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کیسی آہٹ! کوئی نہیں ہے
سوکھا پتہ کھڑکا ہوگا

کہاں کہاں مجھے روکو گے باندھ باندھو گے
میں چڑھتا دریا ہوں ہر سمت بہنے والا ہوں

سیّد فضل المتین کی غزل گوئی کے متعلق پروفیسر عنوان چشتی نے لکھا ہے کہ:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متین نے نظم اور غزل کی سرحدیں توڑی ہیں۔ غزل کا ہر شعر بنیادی طور پر ایک اکائی ہوتا ہے مگر کبھی کبھی شاعر کا ایک جذبۂ مسلسل کئی شعروں میں نظر آتا ہے۔ متین کے یہاں ان کا جذبہ ہر شعر میں کارفرما ہے۔ راجستھان کے بزرگ شعرا تو کلاسیکی اقدار پر قدرت رکھتے ہی تھے، جدید شعرا کو بھی زبان، بیان اور اسلوب اور پیرایہ کا احساس ہے۔ متین نے پرانے الفاظ کو نئی معنویت اور بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔'' (''پہلی آواز'' مرتبہ ممتاز شکیب ص ۷۸)

سیّد فضل المتین کے بعد ایک اور معمر شاعر اور احتشام اختؔر کے معاصر شاعر اعجازؔ اجمیری ہیں، درگاہ آفس کی ملازمت کے دوران احتشام اختؔر کا ان سے بھی ربط ضبط رہا۔ اعجازؔ صاحب سنجیدہ، کم گو، منکسر المزاج شخص تھے۔ ان کا شمار اجمیر کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام راجستھان اُردو اکادمی سے شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے حضرت خواجہ اجمیری کے پیرو مرشد شیخ الشیوخ حضرت عثمان ہرونیؒ کی مبارک زندگی اور حالات پر ایک پاکیزہ رسالہ ترتیب دیا تھا اور اجمیر سے ایک ہفتہ وار اخبار ''انقلاب''

بھی جاری کیا تھا، ان سے تربیت پانے والوں میں احمد رئیس، ممتاز راشد، ڈاکٹر اظہار مسرت، حافظ اجمیری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دیکھنا ہے کہ وہی اس کی روش ہے کہ نہیں
مری آواز میں پہلی سی کشش ہے کہ نہیں

آسان کتنے تھے مجھے دو دن گذارنے
دُشوار کر دِیے ہیں ترے انتظار نے

یہ وہ شعرا ہیں جن کا احتشام اختر تہہِ دل سے احترام کرتے ہیں لیکن اجمیر کے کچھ ایسے شعرا بھی ہیں جن سے احتشام اختر کے دوستانہ مراسم رہے ان میں پہلا نام موہن سروپ سیرت اجمیری کا ہے۔ آنجہانی سیرت اجمیری عمر میں احتشام اختر سے کافی بڑے تھے کیونکہ جب احتشام اختر بی۔ اے۔ کے سال اوّل میں تھے۔ تب سیرت اجمیری کی ملازمت پوری ہونے میں چند سال باقی تھے۔ لیکن سیرت اجمیری بہت زندہ دل، ہنس مکھ اور خوش مذاق پنجابی تھے۔ اور اس باعث ان سے احتشام اختر کا دوستانہ تعلق رہا۔ عمر کا فاصلہ ان کے درمیان نہیں رہا۔ احتشام اختر اور ممتاز راشد جیسے جدید شعرا کے ساتھ رہ کر قدیم رنگِ سخن کو چھوڑ کر جدید رنگِ سخن کی طرف مائل ہو گئے اور جدید رنگ میں انھوں نے بہت اچھے شعر کہے۔ کبھی کبھی وہ مزاحیہ شعر بھی کہہ دیتے تھے۔ موہن سروپ کی شاعری کے متعلق سیّد فضل المتین نے لکھا ہے کہ:

''امین آباد (پاکستان) جائے پیدائش لیکن وطنی نسبت اجمیر کے ساتھ دینے میں انھیں خوشی ہی نہیں، طمانیت بھی ہے۔ لاہور میں زندگی کے

یادگار دن گذارے، وہاں کی ادبی صحبتوں میں شریک رہے۔ سلسلۂ روزگار آزادیِ وطن سے بہت پہلے ہی ہندوستان لے آیا۔ یہاں شمال و جنوب کے شہروں کی سیّاحی مقدر ٹھہری، گھوم پھر کر اجمیر آ گئے۔ برسوں سے مقیم ہیں۔ یہاں ہی محکمۂ پوسٹ آفس سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے دوست دار، مخلص، ملنسار اور اُردو شیدائی ہیں۔ اوائل عمری سے شعر کہتے ہیں۔ قدیم رنگ سے جدید رنگ کو اختیار کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ شاعر زندہ ہے۔ مزاحیہ اشعار بھی بہت اچھے کہے ہیں مگر اپنی شاعری کے اس رنگ کی ان کے یہاں اہمیت نہیں ہے۔ سرخ و سپید رنگت کے بلند قامت پنجابی ہیں۔ پنجاب کی زندہ دلی ان کی فطرت کا حصّہ ہے۔ ایک من موجی، لاابالی، مست قلندر انسان ہیں۔ تحت میں شعر پڑھنے کا انداز ایسا ہے کہ مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔''

(''موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر'' مرتبہ سیّد فضل التین)

سیرتؔ اجمیری کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

زخم اب دل کے چمک دیتے ہیں ہیروں کی طرح
ہم ترے شہر میں رہتے ہیں امیروں کی طرح

کردیا قید ہمیں وقت کی دیواروں نے
ورنہ ہم لوگ بھی تھے چھوٹتے تیروں کی طرح

شکستہ پر ہیں تو جکڑا ہے وقت نے ہم کو
ہَوا کے دوش پہ ہوتے تو ہاتھ آتے کیا

© انجم آفاق
آفاق منزل، شری پورہ، نزد رتن موٹر گیراج،
کوٹہ (راجستھان)
فون: 0744-2326485 موبائل: 9829029911

اشاعت : ۲۰۰۴ء
قیمت : ایک سو پچاس روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق : وجے گرافکس، نئی دہلی
مطبع : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی

ISBN : 81-8042-065-5

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متّل

باختیار تقسیم کار:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

سیرت اجمیری کے علاوہ دیگر معاصرین میں ممتاز راشد، منان راہی، رام لال ندیم اور احمد رئیس کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ ممتاز راشد اجمیر کے مشہور شعرا میں سے ہیں ان کا ایک شعری مجموعہ ''بھیگا ہوا کاغذ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مجموعے کے دیباچے میں مخمور سعیدی لکھتے ہیں:

> ''ممتاز راشد کے یہاں جذبے کی شدت ہے لیکن اس کے دوش بہ دوش فکر کی ایک زیریں لہر بھی ہے جو جذبے کی شدت کو اعتدال کی طرف لے جاتی ہے اور اُسے سنجیدگی اور شائستگی کا وصف عطا کرتی ہے یہ غالباً انھیں ان کے عہد کی دین ہے جس میں خود احتسابی اور خود ضبطی کے بغیر کوئی اظہار معتبر نہیں ٹھہرتا۔'' (''بھیگا ہوا کاغذ'' دیباچہ)

ممتاز راشد شمالی یو۔ پی۔ کے غیر معروف قصبے میں پیدا ہوئے بچپن اجمیر میں گزرا وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گھریلو حالات کے نشیب و فراز کے باعث اچانک دو تین سال کے لیے تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پھر پرائیویٹ طور پر انٹر کا امتحان دیا اور کامیابی حاصل کی مگر آگے پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اب ۱۹۶۶ء سے بمبئی میں مقیم ہیں۔ جب بھی اجمیر آتے تھے تو احتشام اختر سے ضرور ملتے تھے۔ احتشام اختر کا یہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔

اجمیر میں احتشام اختر کی اکثر شامیں ممتاز راشد، سیرت اجمیری اور رام لال ندیم کے ساتھ گزرا کرتی تھیں۔ یہ لوگ مدار گیٹ، جو اجمیر کا ایک بارونق بازار ہے، اس کا طواف کرتے تھے۔ اور سڑک پر چلتے خوبصورت چہروں سے مواد اور Inspiration حاصل کرتے تھے یا پھر گجراتی ہوٹل اور ریسٹوران Elite کے ہال میں بیٹھتے تھے۔ جب احمد رئیس پاکستان سے اجمیر آتے تھے تو اس بزمِ یاراں میں وہ بھی شامل ہو جاتے۔ ممتاز راشد کا شعری مجموعہ ''بھیگا ہوا کاغذ'' بلاشبہ جدید اُردو غزل میں ایک خوبصورت

اضافہ ہے۔ ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی ممتاز راشد کی کئی غزلیں پنکج اُدھاس نے اپنی مخصوص آواز میں پیش کی ہیں۔ اس بات کا اعتراف احمد رئیس نے اپنی کتاب ''موجودہ اور نمائندہ شعرا کے حوالے سے'' میں بھی کیا ہے۔ ممتاز راشد کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

کوئی تحریر مٹائیں تو دُھواں اُٹھتا ہے
دل وہ بھیگا ہوا کاغذ ہے کہ جلتا ہی نہیں

نہ چھین مجھ سے مرے روز و شب کے ہنگامے
میں جی رہا ہوں مجھے یہ گمان رہنے دے

اس حلقۂ احباب میں رام لال ندیم بھی احتشام اختر کے بہت قریب رہے۔ رام لال ندیم کی مادری زبان اُردو نہیں تھی لیکن کوشش کر کے اُردو سیکھ لی تھی۔ رسائل میں ان کا کلام بھی چھپتا ہے۔ ''موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر'' کے مرتب سیّد فضل المتین نے رام لال ندیم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''کم سخن ہیں اور کم گو ہیں مگر جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ کم سخنی اور کم گوئی ہی ان کی کامیابی کی دلیل اور روشن مستقبل کی سبیل ہے۔''

(موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر'')

ندیم کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

روز و شب گرم ہَواؤں کے ستم سہتا ہے
دل وہ دریا ہے جو مٹّی سے بھرا رہتا ہے

تمام عمر تعاقب میں روشنی کے رہے
وہ جگمگاتا بدن پھر کہاں دکھائی دیا

اجمیر کے احباب میں اور بھی کئی نام ہیں لیکن اس مختصر مقالے میں سب کی تفصیل ممکن نہیں۔

احتشام اختر جب علی گڑھ گئے تو وہاں بھی ان کے احباب کا ایک حلقہ قائم ہو گیا۔ اس قافلے میں شہاب عراقی، مرزا خلیل بیگ، اعجاز عبید، صلاح الدین پرویز وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان احباب میں اعجاز عبید، شہاب عراقی اور مرزا خلیل بیگ نے تو بعد میں شعر گوئی ترک کر دی لیکن صلاح الدین پرویز بہت دور تک گئے ''جنگل''، ''ژاژ'' وغیرہ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ''سارے دن کا تھکا ہوا پُرش'' جیسے کامیاب ناول بھی شائع ہوئے۔ انھوں نے فلمیں بھی بنائیں۔ آج کل دہلی سے ''استعارہ'' کے نام سے ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ امیر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بھائی اور خود ان کا اپنا کاروبار ہے جو سعودی عرب اور امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ آج کل دہلی میں مقیم ہیں۔

اجمیر کی طرح علی گڑھ میں بھی کچھ سینئر شعرا سے ربط ضبط رہا اور چونکہ یہ شعرا ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہم ان کا شمار احتشام اختر کے معاصرین میں کر سکتے ہیں۔ علی گڑھ کے شمشاد مارکیٹ میں مکتبہ جامعہ کی بک ڈپو ہے اس وقت مکتبہ جامعہ علی گڑھ کے منیجر بزمی بھارتی مرحوم تھے جو خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ احتشام اختر کی روزانہ اسی دوکان پر نشست رہتی تھی۔ یہاں منظور ہاشمی اور غلام مرتضیٰ راہی وغیرہ بھی آجایا کرتے تھے۔ ہر روز محفل جمتی تھی۔ کبھی کبھی بشیر بدر اور ساحل احمد وغیرہ آتے تھے۔

بشیر بدر اگرچہ بہت سینئر تھے مگر وہ نوجوانوں سے گھلنا ملنا پسند کرتے تھے اور اکثر طالب علموں کے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ صلاح الدین پرویز، شہاب عراقی اور

احتشام اختؔر کا بشیر بدر کے ساتھ اکثر اُٹھنا بیٹھنا تھا۔

بشیر بدر کا یہ ابتدائی دور تھا۔ یہیں سے انھوں نے مشاعروں میں شہرت حاصل کی۔ اور ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''اکائی'' بھی علی گڑھ ہی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد تو کئی مجموعے شائع ہوئے۔ اب تو انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے اور وہ پدم شری کے خطاب سے نوازے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں کئی رسالوں نے خصوصی شمارے اور گوشے بھی شائع کیے ہیں۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ جیسے نقاد انھیں مشاعروں کا شاعر سمجھتے ہیں۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد بشیر بدر میرٹھ چلے گئے تھے اور وہاں اُردو کے لیکچرر مقرر ہو گئے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اُنھوں نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی اور بھوپال میں ڈاکٹر رضیہ حامد کی چھوٹی بہن راحت سے دوسری شادی کر لی اور اب بھوپال میں ہی مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی ہے۔ بشیر بدر کے کئی اشعار بے حد مقبول ہوئے ہیں ان میں سے مثال کے طور پر دو شعر میں پیش کر رہی ہوں:

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا تیرا ہم سفر کہاں ہے

بشیر بدر نے احتشام اختؔر کے دوسرے شعری مجموعے ''نیلا آکاش'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ (احتشام اختؔر) غزل کے شاعر ہیں ان کے مزاج میں غزل کی پُرسوز اور مہذّب داخلیت رچ بس چکی ہے۔ لفظوں کی مزاج شناسی اور انھیں

تخلیقی انداز سے برتنے کا فن انھیں خوب خوب آتا ہے۔ احتشام اختر اپنے شعری تجربے کو کم سے کم الفاظ میں حسن سے بیان کرنے میں پوری قدرت رکھتے ہیں۔ وہ تین چار مختصر ترین مصرعوں میں بڑے اہم تجربوں کے اظہار پر قادر ہیں......"

(ماہ نامہ آج کل نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۸۶ء جلد ۴۵ شمارہ نمبر ۳/ص ۴۶ تبصرہ نیلا آکاش از بشیر بدر)

جیسا کہ ہم آگے اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ مکتبہ جامعہ علی گڑھ میں غلام مرتضیٰ راہی بھی آیا کرتے تھے اور احتشام اختر سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ اس لیے احتشام اختر کے معاصرین میں ان کا شمار بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔

راہی اُن دنوں علی گڑھ شہر میں Road ways میں ملازم تھے۔ ان کے پہلے دو مجموعے "لامکاں"، "لاریب" علی گڑھ ہی میں شائع ہوئے اور کافی مقبول بھی ہوئے۔ حال ہی میں ان کا تازہ مجموعۂ کلام "لاکلام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ بیچ میں راہی نے لکھنا بند کر دیا تھا، اور بقول شمس الرحمٰن فاروقی "ان کا قلم اس طرح رُکا کہ شعر گوئی ان سے چھوٹ گئی۔" لیکن کئی برس کی خاموشی کے بعد انھوں نے پھر لکھنا شروع کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی ان کے تازہ ترین شعری مجموعے "لاکلام" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"راہی کی نئی غزلوں میں آہنگ کا تنوّع گذشتہ مجموعوں سے زیادہ ہے۔ ان کے یہاں آہنگ میں وہ نرم روی تو کبھی نہ تھی جسے بعض لوگ غزل کے لیے ضروری جانتے ہیں، لیکن پچھلی غزلوں کے آہنگ میں جو تنوع تھا وہ غیر یقینی کی منزل سے آگے نہ جاتا تھا گویا شاعر خود یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو کہ کس لہجے میں شعر کہنا ہے۔ اب جو تنوّع ہے اس میں کھردرے پن اور بے یقینی کی جگہ نئے لہجے دریافت کرنے اور انھیں کامیابی سے

نبھا لے جانے کا اعتبار بھی ہے۔ ایسی عمر میں جب اکثر شاعر تھک کر بیٹھ چکے ہوتے ہیں، غلام مرتضیٰ راہی نئے مرحلے تسخیر کر رہے ہیں۔''

(دیباچہ ''لاکلام'' از شمس الرحمٰن فاروقی)

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں:

بے تحاشہ جیے ہم لوگ ہمیں ہوش نہیں
وقت آرام سے گذرا کہ پریشانی سے

آتا تھا جس کو دیکھ کے تصویر کا خیال
اب تو وہ کیل بھی مری دیوار میں نہیں

غلام مرتضیٰ راہی کی طرح منظور ہاشمی بھی احتشام اختر سے سینئر شاعر ہیں۔ لیکن مکتبہ جامعہ کی روزانہ نشستوں سے دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان بے تکلف اور گہرے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ منظور ہاشمی کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو ''بارش'' اور ''آب'' کے نام سے ہیں۔ مؤقر اور معیاری رسائل میں منظور ہاشمی کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بھی آل انڈیا مشاعروں میں منظور ہاشمی شرکت کرتے رہتے ہیں۔ منظور ہاشمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں بقول اسلوب احمد انصاری:

''اپنے نئے پن میں روایت کے انحراف کے باوجود ان کے ہاں وہ ناتراشیدگی نہیں ہے جس کا مظاہرہ جدّت کے نام پر خاصا عام ہے لیکن یہ اظہار حقیقت کا ایک منفی انداز ہوا۔ مثبت طور پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ تجربے کے کھرے پن پر مستزاد ترسیل و ابلاغ کے وسائل پر جیسی

استادانہ قدرت منظور ہاشمی کے حصّے میں آئی ہے وہ کمیاب بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی۔'' (''آب''ص ۷)

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں:

عمر بھر جورہا اجنبی کی طرح
چاہتے تھے اُسے زندگی کی طرح

میرے واسطے شاید خط میں تھا وہی جملہ
تیز روشنائی سے جو کٹا ہوا پایا

احتشام اختؔر کی شخصیت کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ جس شہر میں جاتے ہیں وہ بلا امتیاز عمر و سال ہر ایک کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کے حلقۂ احباب میں بوڑھے اور جوان سبھی شامل ہیں۔ جب گورنمنٹ کالج کوٹہ میں ان کا تقرر بحیثیت لیکچرر ہوا اور انھوں نے یہاں آ کر سکونت اختیار کی تو شعرائے کوٹہ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ کوٹہ کے چند شعرا سے ان کی تقریباً روزانہ ہی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ان میں مائلؔ سعیدی، امینؔ نشاطی، ڈم ڈم کوٹوی، سعیدی محوی، مفتوں کوٹوی، عابدؔ اختر جے پوری، عقیل شاداؔب، ظفر غوری اور ظفر احمد پرواز وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

احتشام اختؔر کے بزرگ اور عمر رسیدہ معاصرین میں مفتوؔں کوٹوی اور ڈم ڈم کوٹوی کا خاص طور سے نام لیا جا سکتا ہے۔ احتشام اختؔر کے کوٹہ آنے کے چند سال بعد ہی مفتوؔں کوٹوی کا انتقال ہو گیا لیکن ڈم ڈم کوٹوی خدا کے فضل و کرم سے اب تک بہ قیدِ حیات ہیں۔

مفتوؔں کوٹوی کا شمار کوٹہ کے ہی نہیں بلکہ راجستھان کے اساتذہ شعرا میں ہوتا ہے۔ احتشام اختؔر کے قیامِ کوٹہ کے ابتدائی عرصے میں احتشام اختؔر کو مفتوؔں کوٹوی سے

ربط ضبط بڑھانے کے مواقع میسر آئے اگر چہ یہ مواقع کم ہی میسر آئے کیونکہ مفتوؔ کوٹوی کم آمیز اور گوشہ نشین شاعر تھے لیکن جب بھی احتشام اخؔتر شعبے کے کاموں سے فرصت پاتے تھے تو وہ مفتوؔ صاحب سے گھر جا کر ملاقات ضرور کرتے تھے۔ کوٹہ کی چند نشستوں میں بھی احتشام اخؔتر اور مفتوؔ کوٹوی کو ایک ساتھ کلام پیش کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ مفتوؔ کوٹوی احتشام اخؔتر کی شاعری کے ساتھ ان کی تنقید نگاری کے بھی مدّاح تھے۔ مفتوؔ صاحب مشاعروں میں بہت کم کسی کو داد دیا کرتے تھے لیکن ایک شعری نشست میں، جو طرحی نشست تھی، اس میں احتشام اخؔتر کا مندرجۂ ذیل شعر سن کر مفتوؔ صاحب نے کھل کر داد دی اور انھیں گلے لگا لیا۔ وہ شعر یہ تھا:

یہ وہ قطرے نہیں جو گوہرِ نایاب بن جائیں
ان اشکوں کی رسائی تو ہماری آستیں تک ہے

(احتشام اخؔتر)

مفتوؔ کوٹوی نے شاعری کے علاوہ مضامین بھی لکھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے لیکن افسوس کہ ان کے مضامین کا مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ مفتوؔ کوٹوی ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۰ء میں وفات پائی۔ مفتوؔ صاحب کلاسیکی رنگ کے اچھے شاعر تھے اور انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

دوست داری تو بڑی چیز ہے لیکن مفتوؔ
دشمنی بھی تو حریفوں سے نبھائی نہ گئی

مفتوؔ غزل نہیں ہے زبانِ شوق میں
یعنی نیا ہے رنگ پرانی بہار میں

دوسرے بزرگ شعرا میں ڈم ڈم کوٹوی ہیں جن سے آگے چل کر احتشام اختر کے بہت گہرے اور قریبی مراسم قائم ہوئے۔ ڈم ڈم صاحب فالج کی وجہ سے ۲۰۰۰ء سے صاحبِ فراش ہیں۔ مئی ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ظریفانہ شاعری کے باعث انھیں راجستھان کے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ ان کا کلام فحش نگاری اور عریانی سے پاک ہے اور شاعری سے ان کا منشا قوم اور ملک کی اصلاح نہیں محض تفریح ہے۔ ان کی شاعری میں طنز بھی ہوتا ہے اور مزاح بھی۔ انھوں نے ابتدا میں صاحب زادہ یٰسین علی خاں نشاط ٹونکی سے اصلاح لی۔ راجستھان اُردو اکادمی نے ڈم ڈم کی شعری خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۱ء میں ''شگوفے'' کے نام سے شعری مجموعہ شائع کیا۔ مثال کے طور پر ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

اک نگاہِ ناز کا پر پینڈی کیولر ڈال کر
رکھ دیا دل کاٹ کر آدھا اِدھر آدھا اُدھر

عشق بھی ہوتا رہے، دوکان بھی چلتی رہے
وقت ہو ڈم ڈم بسر آدھا اِدھر آدھا اُدھر

جدید شاعری کے تعلق سے احتشام اختر عقیل شاداب، اور ظفر غوری سے کوٹہ آنے سے پہلے ہی متعارف تھے۔ کوٹہ کالج میں لیکچرر مقرر ہونے سے پہلے عقیل شاداب جو کوٹہ شہر کے ایک مشہور شاعر ہیں، انھوں نے احتشام اختر کو کوٹہ کے دسہرے میلے میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں بلایا تھا۔ انھیں دنوں عقیل شاداب نے راجستھان کے جدید شعرا کا انتخاب ''سرابوں کے سفیر'' کے نام سے ترتیب دیا جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں احتشام اختر کا کلام بھی شامل ہے۔ ''سرابوں کے سفیر'' کا دیباچہ مشہور

ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔ یہ راجستھان کے جدید شعرا کا اولین انتخاب ہے۔ عقیل شاداب نے جدیدیت کے موضوع پر ایک سیمینار بھی منعقد کروایا تھا۔ یہ بھی راجستھان میں جدیدیت پر پہلا سیمینار تھا۔ عقیل شاداب ایک عرصے سے رسائل میں لکھ رہے ہیں۔ ان کا ایک مونوگراف راجستھان اُردو اکادمی نے شائع کیا جسے خود احتشام اختر نے مرتب کیا ہے۔ عقیل شاداب کی شاعری کے متعلق احتشام اختر نے لکھا ہے:

> ''جدید شعرا میں عقیل شاداب نے اپنا ایک مقام بنالیا ہے، اور ہر صنفِ سخن میں دخل ہے۔ ان کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ سن کر دل میں اُتر جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاداب کا شعری سفر اندر سے باہر کی طرف ہے اور اپنے آپ سے جنگ کرنا ان کا شعار ہے۔ بیشتر اشعار میں اپنے آپ سے لڑائی کا اظہار واشگاف انداز میں ہوا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ عقیل شاداب رومانی شاعری میں بند نہیں ہیں بلکہ ان کا کینوس بہت بڑا ہے اور دن بہ دن بڑا ہوتا جارہا ہے۔ فرائڈ کا اثر واضح ہے اور فلسفے کی جھلکیاں بھی ان کے کلام میں جابجا بکھری پڑی ہیں۔ بلا کی روانی ہے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی ٹھاٹھے مارتا دریا ہے۔''

(تعارف وانتخاب کلام عقیل شاداب ص ۲)

''بے آب سمندر''، عقیل شاداب کی غزلیہ شاعری کا اوّلین مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک کتاب اور ''تذکرہ شعرائے کوٹہ'' کے نام سے بھی مرتب کی ہے۔ جس میں انھوں نے کوٹہ کے شعرا کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ ''بے آب سمندر'' ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ عقیل شاداب کی غزلوں میں جو چیز سب سے زیادہ قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ ان کا اسلوبِ بیان ہے ان کے

انتساب

استاذی محترم پروفیسر (ڈاکٹر) **فیروز احمد** صاحب
صدر شعبۂ اُردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی، جے پور
کی
نذر

یہاں ہندی کے الفاظ کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بے ننگ و نام ہوں میں کوئی نام دو مجھے
اک شہرِ گم شدہ ہوں برآمد کرو مجھے

کرنے کو سب ہی کرتے ہیں شاداب شاعری
الفاظ کس کے پاس اثر کس کے پاس ہے

پنگھٹ سونا ہے چوپال اکیلی ہے
برکھا آنسو بہا رہی ہے واپس آ

عقیل شاداب ہی کے ہم عمر شاعر ظفر غوری کا بھی نام احتشام اختر کے معاصرین میں بہت اہم ہے۔ یہ بھی احتشام اختر سے بہت قریب رہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی شاعری پر فارسی اور انگریزی کا اثر واضح ہے۔ مختلف رسائل میں ان کا کلام کثرت سے چھپتا تھا۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ ''آبادخرابہ'' کے نام سے راجستھان اُردو اکادمی نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔ ظفر غوری کوٹہ کے ممتاز شعرا میں جدیدیت کے حوالے سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

وہ جس کو چاہے چڑھا لے سر پر
عجب ہے ردّ و قبول اس کا

چھوٹا سا گھر ہی سہی اسے رکھیے سنبھال کر
ملکوں کی سمت کی طرح یہ بھی بٹ نہ جائے

ظفر غوری کے علاوہ اسی ۹۰ کی دہائی میں احتشام اختر کے کوٹہ میں اور بھی ہم عصر شعرا رہے جن میں ظفر احمد پرواز، لطفی کوٹوی، شاد کوٹوی، توفیق کوٹوی، روشن کوٹوی، بہار صدیقی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں لیکن سب کا فرداً فرداً ذکر کریں گے تو یہ مقالہ حد سے زیادہ طویل ہو جائے گا۔

احتشام اختر کی خوبی یہ ہے کہ وہ نوجوانوں اور بچوں میں بھی گھل مل جاتے ہیں۔ جہاں ان کے تعلقات عمر رسیدہ اور بزرگ شعرا سے رہے وہیں بالکل اسی طرح نوجوان شعرا سے بھی وہ قریب رہے۔ وہ اپنے شاگردوں سے بھی دوست کی طرح ملتے ہیں بلکہ وہ اکثر طلبا کے درمیان خوش مذاقی میں یہ بات کہتے ہیں:

''میں نے درس و تدریس کا پیشہ اسی لیے اختیار کیا کہ اپنے آپ کو ہمیشہ تر و تازہ اور جوان محسوس کر سکوں۔''

احتشام اختر نے نوجوان شعرا کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے اور وہ اکثر فضل المتین صاحب کا یہ شعر دہراتے ہیں:

نظر ہے ان پہ جو شمس و قمر بنیں گے کبھی
خیال کیا کریں ان کا جو ڈھلتے سائے ہیں

جن چند نوجوان شعرا کو احتشام اختر سے رفاقت نصیب ہوئی ان میں فاروق انجینئر، محمد شاہد پٹھان، نعیم دانش اور شکور انور خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

فاروق بخشی حالانکہ عمر میں احتشام اختر سے کچھ کم ہیں لیکن ان سے بھی دوستانہ مراسم رہ چکے ہیں۔ فاروق بخشی گورنمنٹ کالج کوٹہ میں اُردو کے لیکچرر ہیں۔ تبادلہ سے

پہلے احتشام اختؔر ان کے ساتھ اسی کالج میں تھے۔ فاروقؔ بخشی کا پہلا شعری مجموعہ ''پلکوں کے سائے'' دیوناگری رسم الخط میں ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے اور اب ایک شعری مجموعہ بعنوان ''اُداس لمحوں کے موسم'' اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تنقید و تاثر'' زیرِ طبع ہیں۔ ۹۸-۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر فاروقؔ بخشی کو راجستھان اُردو اکادمی سے اعزاز و انعام حاصل ہو چکا ہے۔ ان کی غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

اس کے ہونٹوں پہ بد دعا بھی نہیں
اب مرے واسطے سزا بھی نہیں

حادثے عام ہو گئے اتنے
مڑ کے اب کوئی دیکھتا بھی نہیں

احتشام اختؔر کے معاصرین میں راجستھان کے حوالے سے اور عالمی اُردو شاعری کے پس منظر میں مخمورؔ سعیدی، شینؔ کاف نظامؔ، ممتازؔ شکیب، خداداد خاں مونسؔ، شاہد عزیز، شاہد میرؔ، عابد ادیبؔ اور خوشترؔ مکرانوی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ راجستھان کے مشہور و معروف شاعر ہیں اور ملک و بیرونِ ملک کا کوئی ادبی رسالہ ایسا نہیں جس میں ان کا کلام شائع نہ ہوا ہو۔ دراصل یہ وہ شاعر ہیں جن کے کلام سے راجستھان ادبی دنیا میں مفتخر ہوا۔

OO

باب سوم

احتشام اختؔر
کی غزل گوئی

O

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

جاں نثار اختر کے اس شعر سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن میں صنفِ غزل کی وسعت اور اس کے امکانات کا کامیاب پس منظر موجود تھا تبھی انھوں نے غزل کے فن کی یہ خوبصورت اور جامع تعریف بیان کی ہے۔ حقیقت پر غور کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اتنے ادوار میں سے ابھی تک ایسا کوئی دور نہیں آیا جب غزل کی اہمیت اور مقبولیت کم ہوئی ہو۔ آج موجودہ حالات میں جبکہ یہ صدی نثر کی صدی ہے، ابھی بھی صنفِ غزل گوئی اپنے پورے شباب پر ہے اور ہر دل عزیز صنفِ سخن ہے۔ آج بھی اس صنف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے قابلِ لحاظ تعداد میں مل جائیں گے جنھوں نے غزل کو زنگ آلود ہونے سے بچائے رکھا ہے۔ پورے ہندوستان میں اور دورِ حاضر میں غزل کی خدمت کرنے والوں کا اندازہ لگانا تو دُور کی بات ہے اگر ہم راجستھان کے محض کسی خطّے کا ہی جائزہ لیں تو بڑی تعداد میں غزل کہنے والے مل جائیں گے۔ کوٹہ شہر کو لیجیے یہاں بڑی تعداد میں غزل پر طبع آزمائی کرنے والے موجود ہیں۔ ان میں مائل سعیدی، مفتوں کوٹوی، عمر کوٹوی، ظفر غوری، ظفر احمد پرواز، عقیل شاداب اور احتشام اختر وغیرہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے اس فن میں آسمان چھو لیا ہے اور

اس بلندی پر وہی پہنچ سکتا ہے جس کا مشاہدہ وسیع اور نگاہ عمیق ہو۔ جدید دور کے منفرد شاعر احتشام اختر اپنے ایک شعر میں لکھتے ہیں:

گگن کی اونچی اُڑانوں کا مستحق ہے وہی
کہ جس کا دل ہو بڑا اور ہو نگاہ بلند

بلندی تک پہنچنے کے لیے احتشام اختر کی یہ شرطیں بالکل واجب ہیں۔ بہرحال مذکورہ بالا سطور میں ہم نے موجودہ دور میں غزل کی اہمیت پر اس لیے زور دیا ہے کیونکہ غالب کے دور کے بعد کئی بار یہ سوچا گیا کہ غزل اپنے پورے امکانات ادا کر چکی ہے اور اس کی طرف اب زیادہ توجہ دینا تخلیقی صلاحیتوں کا گلا گھونٹنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر دَور میں نہ صرف اچھی غزل ظہور میں آئی بلکہ غزل کا فروغ کچھ اس طرح ہوا کہ وہ تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے ذہن وادراک کا ساتھ دے سکی۔ حالی، عظمت اللہ خاں، اور کلیم الدین احمد وغیرہ کے اعتراضات کے باجود غزل نے ارتقا کی نئی منزلیں سر کیں۔ یہ بات جتنے وثوق کے ساتھ راجستھان کے باہر کی غزلیہ شاعری کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، اتنے ہی یقین اور اعتماد کے ساتھ راجستھان کی غزلیہ شاعری کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ یہاں چونکہ تفصیلات مانع ہیں اس لیے ہم صرف احتشام اختر کی غزلیہ شاعری تک اپنی گفتگو محدود رکھیں گے۔

ہمارا مقصد احتشام اختر کی غزل گوئی کا جائزہ لینا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم ان عوامل کا بھی ذکر کرتے چلیں گے جن کا احتشام اختر کی جدید شاعری میں بنیادی رول ہے۔

آج ہر صنفِ سخن کو جدیدیت کی کسوٹی پر پرکھ کر قاری کے سامنے لایا جاتا ہے، کیونکہ آج کا انسان ہر چیز کو عقل اور سائنس کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور وہ ادیب اور شاعر سے بھی یہی اُمید کرتا ہے کہ وہ محض حسن وعشق کی داستانیں ہی نہ بیان کریں بلکہ ان کی شاعری حقیقت سے قریب ہو، اس میں سیاسی اور سماجی حالات کی تصویریں

ہوں، سماجی ناہمواریاں، بے بسیاں اور زندگی گذر بسر کرنے کی ایک عام آدمی کی کشمکش یعنی زندگی کے ہر پہلو کی جانب اس کی نظر ہو۔ اس کی شاعری میں اکہرا پن نہ ہو۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر جب ہم احتشام اختؔر کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ احتشام اختؔر کی شاعری اس معیار پر پوری اُترتی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ صرف جدید عہد کی ناہمواریوں اور جذبوں تک ہی محدود ہے بلکہ ان کے یہاں روایتی موضوعات کا بھی بیان ملتا ہے۔ یعنی یہ کہ جس طرح جدید شاعری کی تمام شرائط پر وہ پورے اُترتے ہیں وہیں روایتی موضوعات پر جب قلم اُٹھاتے ہیں تو ان موضوعات میں بھی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور یکسانیت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں عبدالمتین جامؔی لکھتے ہیں کہ:

> ''موصوف کے یہاں جس طرح عہدِ جدید کی تمام ناہمواریوں کا بیان ملتا ہے اسی طرح محبوب کے فراق اور وصال جیسے روایتی موضوعات کا بھی خلاّقانہ بیان نظر آتا ہے۔ غالباً اس طرح انھوں نے اپنی شاعری کو یکسانیت کے الزام سے بچانے کی سعی کی ہے۔''

(''سہ ماہی رنگ'' احتشام اختؔر جدید شاعری کی معتبر آواز ص ۲۳ شمارہ ۱۵)

عبدالمتین جامؔی صاحب کی اس رائے کی روشنی میں ہم ایک اور صاحب ڈاکٹر محمد انصاراللہ کی رائے بھی پیش کرنا چاہیں گے اور یہ رائے بھی اس سلسلے میں ایک اچھا ثبوت ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> ''.....اس میں شبہ نہیں کہ ان کی طبیعت کا میلان شروع سے جدید ادب کی طرف رہا ہے لیکن قدیم ادب کی طرف سے بھی انھوں نے کبھی غفلت یا بے اعتنائی نہیں برتی.....''

(تبصرہ ''نیلا آکاش'' مطبوعہ قرطاس ناگپور، ص ۴۵، جولائی-اگست ۱۹۸۶ء، جلد نمبر-۳، شمارہ-۶)

کلاسیکی رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمارے غم کی رعنائی بس ان کی اک نہیں تک ہے
کہ اس خاتم کی زیبائش گراں قیمت نگیں تک ہے

گذر گاہِ حقائق میں ہمارا ساتھ مشکل ہے
جہاں ہے موڑ خوابوں کا ہماری حد وہیں تک ہے

وہ اپنی تمکنت کے راز سے واقف نہیں اختؔر
کہ مارِ درد کی قیمت بس اک لعلِ حسیں تک ہے

ہمارا موضوع چونکہ احتشام اختؔر کی غزل گوئی کے جائزے سے متعلق ہے لہٰذا اس بارے میں میرے خاص معروضات یہ ہیں کہ احتشام اختؔر کسی ایسی شخصیت کا نام نہیں ہے جو بنی بنائی مکمل شکل میں آسمان سے اُتری ہو بلکہ ان کے رنگِ سخن کو پرکھنے کے لیے بھی ہمیں ان سارے Factors کو ملحوظ خاطر رکھنا ہے جن کا تذکرہ ہم پہلے یعنی حیات و شخصیت کے باب میں کر چکے ہیں اور یہاں بھی ان عوامل و محرکات پر سرسری نظر سے غور کرنا ضروری ہے کیونکہ چند اہم عوامل ایسے ہیں جن کا ذکر کیے بغیر احتشام اختؔر کے رنگِ غزل کو سمجھنا ناممکن نہیں تو دُشوار ضرور ہوگا۔ احتشام اختؔر کے بچپن اور جوانی کا ابتدائی زمانہ، جو بہت پریشانیوں اور مصیبتوں میں گزرا اور والدین کی وفات کے بعد جو تکلیفیں انھوں نے اُٹھائیں ان تمام باتوں کا ذکر ہم حالات و شخصیت کے باب میں تفصیل سے کر چکے ہیں۔ تو ظاہری بات ہے کہ ان پریشانیوں اور مصیبتوں کا عکس ان کی شاعری میں جا بجا در آیا ہے اور اس لحاظ سے ان کی شاعری ان کی آپ بیتی بن گئی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی غزلوں کی کتاب ''صبح کا ستارہ'' کے حرفِ

اوّل میں خود کہا ہے:

''اچھی شاعری کی پہچان یہی ہے کہ وہ آپ بیتی ہوتے ہوئے جگ بیتی ہوتی ہے۔ میری آپ بیتی کہاں تک جگ بیتی بن سکی ہے اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔''

احتشام اختر کی غزل گوئی کے لیے اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کے یہاں مایوسی، بے چہرگی اور زندگی سے بے زاری ہے۔ دراصل اگر کسی شاعر کا دور خوش گوار گزرا ہے تو اس کی شاعری میں بھی خوشیوں اور مسرتوں کی لہریں دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں اور اگر وہ تکلیفوں اور پریشانیوں سے دو چار ہوا ہے تو اس کی شاعری میں وہی دردناک فضا سانس لیتی نظر آتی ہے۔ اور یہی حالات احتشام اختر کے بھی ہیں اور چونکہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ پریشانیوں اور مصیبتوں میں گزرا ہے اس لیے ان کے یہاں اُداسی اور سوگواری فطری ہے اور اس کے پیشِ نظر کچھ نقادان کی شاعری کا سرا فانیؔ اور میرؔ کی حزنیہ شاعری سے ملا دیتے ہیں۔ میری نظر میں میرؔ اور احتشام اختر میں ایک مماثلت یہ تو ہے کہ میرؔ کی پرورش بھی ان کے ماموں نے کی اور احتشام اختر کی پرورش بھی ان کے ماموں نے کی۔ فانیؔ اور احتشام اختر کے غم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ احتشام اختر کے یہاں یاسیت یا نا اُمیدی نہیں ہے۔ انھوں نے رجائیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ کئی بار ہمت بھی ہارے مگر خود کو خود ہی حوصلہ بھی بندھایا، کئی بار ٹوٹ کر بکھرے مگر خود اپنے آپ کو سمیٹا بھی اور انھیں غم کے اندھیروں میں بھی اُمید کی کرن نظر آتی ہے اور کہہ اُٹھتے ہیں کہ:

خندق کی اُداسی میں اُمید مہکتی ہے
پربت کی بلندی سے تنویر اُبھرتی ہے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ترتیب

- ❑ دیباچہ/ پروفیسر فیروز احمد 9
- ❑ پیش لفظ/ انجم آفاق 11

- ○ باب اوّل:
  احتشام اختر: سوانح و شخصیت 15

- ○ باب دوم:
  احتشام اختر اور ان کے معاصرین 35

- ○ باب سوم:
  احتشام اختر کی غزل گوئی 57

اس ایک شخص کا میں منتظر ہوں برسوں سے
جو کہہ گیا تھا مرا انتظار مت کرنا

گھر کو کاندھے پہ لیے پھرتا ہوں
مجھ میں یہ تاب و تواں ہے اب بھی

ویران ہے مدّت سے یہ دل کا مکاں یارو
وہ آ کے محبت سے اس گھر کو سجا دیں گے

بہت یوں تو شکستہ ہے یہ اختؔر
مگر دیوار کا سایا بہت ہے

یہی سوچ کر دُھوپ میں چل رہا ہوں
کہیں تو ملیں گے وہ سائے گھنیرے

عشق ایک فطری جذبہ ہے اور یہ ہماری شاعری میں اساسی حیثیت رکھتا ہے اور اگر ہم چراغ لے کر بھی ایسا شاعر تلاش کریں جس کا کلام حسن و عشق کے جذبات سے خالی ہو تو مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اسی لیے ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

''جس طرح انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آ سکتی اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتی رہیں گی۔'' (اُردو غزل از یوسف حسین خاں ص ۱۰۳)

احتشام اختؔر کی عشقیہ غزلیں ان کے احساسات اور دلی جذبات کی بہترین

آئینہ داری کرتی ہیں۔ احتشام اختؔر کی غزلوں میں اکثر محبوب کی جدائی کا غم، محبوب سے شکایت، اور جسے چاہتے تھے اُسے نہ پانے کا غم وغیرہ کا اظہار بہت شدّت سے ہوا ہے۔ ان کی اسی طرح کی شاعری کے زیرِ اثر رفعت اختر انھیں ''وصال کا نہیں ہجر کا شاعر'' قرار دیتے ہیں۔ دراصل اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ جسے پانا چاہتے تھے اس کو پا نہ سکے اور اسی لیے اپنے دل کی تڑپ اور ادھوری خواہشات کے اظہار کا ذریعہ ان کی شاعری بنی۔ وہ خود اس بات کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں کہ:

میری غزلوں، میری نظموں میں سارے عشق کے قصّے
کسی دلبر کو پانے کی ادھوری کامنا کے ہیں

عشقِ گلفام کے آغاز میں ہم
اپنا انجام لیے پھرتے ہیں

وہ مرے پاس نہیں ہے لیکن
اس کے ہونے کا گماں ہے اب بھی

تمام عمر مہکتے رہیں گے دل میں مرے
تمھارے پیار کے زخموں کی ہے مثال کہاں

دل بہل جاتا ہے تنہائی میں
اس کی یادیں ہیں کتابوں کی طرح

اب کسی بھی بات پر روتا نہیں
دل مرا گویا قلندر ہوگیا

سلام اور پیام ہم تو کچھ نہ لکھ سکے اُسے
کہ خواہشوں کی وہ دوات ہی بکھر کے رہ گئی

اُفق سے غم کے ماہتاب کب نظر تو آئے گا
کہ انتظار میں یہ رات ہی بکھر کے رہ گئی

اب تو مرنا بھی ہوا ہے مشکل
مجھ کو جینے کی دُعا دی کس نے

یوں تو مکاں وہی ہے مگر وہ مکاں نہیں
رونق تھی جس سے گھر کی وہ جانِ جہاں نہیں

الفت میں حسینوں کی ستم اتنے سہے ہیں
بھولے سے بھی اب ہم تو محبت نہیں کرتے

گو چاہتا تھا بہت پر یہ مجھ سے ہو نہ سکا
میں ارضِ دل میں محبت کا بیج بو نہ سکا

زندگی کی کتاب میں اختر
اک محبّت کا باب ہونا تھا

پیار میں اُس نے بے وفائی کی
یہ تو آخر جناب ہونا تھا

احتشام اختؔر کے مذکورہ بالا اشعار کی طرح اُن کے ایسے اور متعدد اشعار ہیں جو اُن کے دلی جذبات اور محبت کے نازک رشتوں کی آئینہ داری کرتے ہیں، اور قاری کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کے اسی طرح کے اشعار کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر عنوانؔ چشتی رقم طراز ہیں:

''.....احتشام اختؔر اس نکتہ سے آگاہ ہیں کہ شاعری ''بیانِ واقعہ'' نہیں بلکہ ''واقعہ کا اظہار'' ہے اس لیے ان کی بیشتر مختصر نظمیں اور غزلوں کے بہت سے اشعار مخصوص لمحاتی تاثرات کا فنّی اظہار ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری پر غیر ضروری سنجیدگی اور نیم پختہ بلوغیت کا غلاف چڑھانے کی مصنوعی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنے جوان جذبات، خوں گشتہ آرزوؤں، ناکام خواہشوں، خوابوں اور محبت کی دل پذیر کیفیتوں کو ان کی فطری معصومی اور دلکشی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔''

(''راکھ'' اہلِ نظر کی رائے میں ''نیلا آکاش'' ص ۱۵۷)

احتشام اختؔر کی غزل گوئی کے رنگ کو سمجھنے کے لیے عنوان چشتی کا یہ قول بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ ''رنگ'' دراصل بات کہنے کے اس مخصوص انداز کو کہتے ہیں جس میں بات کہنے والے کی شخصیت کا مکمّل پرتو نظر آئے اور جس سے اس کی امتیازی پہچان بھی قائم ہو سکے۔ ابتدا میں ہم نے ان کے یاس انگیز کلام کا ذکر کیا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زندگی سے لطف اندوز ہونا نہیں جانتے بلکہ ان پر یہ سراسر الزام ہے کہ ان کی غزلوں میں صرف محرومی، ناکامی، رنج و غم اور ناامیدی ہے اور اس

کے سوا کچھ بھی نہیں۔ان کی غزلوں کا مجموعہ ''صبح کا ستارہ'' اور ''راکھ'' کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں وطن پرستی، ملک میں بپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، جہیز کی لعنت اور مناظرِ فطرت جیسے موضوعات پر بھی متعدد غزلیں ہیں۔ یہ بالکل صحیح نہیں ہے کہ کسی شاعر کی شاعری کے صرف ایک پہلو پر ہی غور کیا جائے بلکہ اُن تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھنا چاہیے جو اس کی شاعری میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔احتشام اختؔر کے شاعرانہ مرتبے کا تعین کرنے میں یہ تمام پہلو ہمیں پیشِ نظر رکھنے چاہئیں اور اس لحاظ سے ہم مناظر فطرت کے موضوع پر اُن کے اشعار دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے انفرادیت برقرار رکھی ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

چڑھا ہوا تھا جو دریا اُتر گیا لیکن
ہماری اونچی عمارت کو ڈھا گیا پانی

پرندے چہچہاتے ہیں ہُوا جنگل میں پھر منگل
کرشمہ یہ تو سارا ہے حسیں سرسبز پیڑوں کا

بہاروں کا یہ موسم ہے میں گھر میں رہ نہیں سکتا
مجھے اختؔر بلاوا ہے حسیں سرسبز پیڑوں کا

دُھوپ جب آجائے گی کہسار میں
برف کی اُجلی رِدا لے جائے گی

مذکورہ بالا اشعار احتشام اختؔر کی فنکارانہ صلاحیت اور اُن کی انفرادیت کی دلیل ہیں۔
احتشام اختؔر راجستھان کے جدید شعرا کی صف میں بلند مقام کے مالک ہیں۔

انھوں نے ادب کی بدلتی ہوئی قدروں اور نئے رجحانات کا ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے۔ دراصل احتشام اختؔر نے اس وقت جدیدیت کی طرف رُخ کیا جب راجستھان میں روایتی شاعری کا بول بالا تھا اور نوجوان شعرا بھی اس حد تک روشن خیال تھے کہ وہ ترقی پسند شاعری کو ہی جدید شاعری خیال کرتے تھے اور کیفؔی اعظمی اور سردار جعفری کو جدید شاعر سمجھتے تھے۔ راجستھان کے نئی نسل کے شعرا نے ناصؔر کاظمی، شکیبؔ جلالی اور ظفر اقبالؔ کا نام تک نہیں سنا تھا۔ جن لوگوں نے راجستھان میں جدیدیت کی شمع روشن کی ان میں خوشترؔ مکرانوی، ظفرؔ غوری، ممتاز راشدؔ، فضل المتین، شین کاف نظامؔ، عقیل شاداؔب، اور شاہد عزیؔز وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں اور اسی صف میں احتشام اختؔر کا بھی شمار ہوتا ہے۔ جدیدیت کے متعلق احتشام اختؔر کا اپنا خیال یہ ہے:

> ''جدیدیت کے مخالفین یہ الزام لگاتے ہیں کہ جدید شاعر میں سماجی اور سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ جدید شاعر اپنی ذات کے خول میں سمٹا رہتا ہے۔ یہ الزام صحیح نہیں ہے۔ شاعر روایتی ہو یا جدید وہ انسان ہوتا ہے اور انسان ایک سماجی ذی روح ہے۔ چنانچہ وہ اپنے معاشرے اور سماج سے الگ ہو کر نہ تو کچھ سوچ سکتا ہے اور نہ ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک حساس شاعر اپنے معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات سے نہ صرف یہ کہ باخبر رہتا ہے بلکہ انھیں شدت سے محسوس بھی کرتا ہے۔ اس میں جدید شاعر کی تخصیص نہیں ہے، یہ بات ہر شاعر پر لاگو ہوتی ہے۔'' (''صبح کا ستارہ'' حرفِ اوّل)

اس اقتباس سے جدیدیت کے متعلق احتشام اختؔر کے خیالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور ان کے اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری یک رُخی نہیں ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں انسانیت کے احترام کا

جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ وہ امیروں کے ذریعے غریبوں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور استحصال کے خلاف بھی آواز بلند کرتے ہیں۔ غریبوں کے لیے ان کے دل میں ہمدردی ہے وہ ایک دردمند اور انسانیت کے جذبے سے سرشار دل رکھتے ہیں۔ اس نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

گھر جلاتے ہیں غریبوں کے مگر یاد رہے
خود نہ جل جائیں کہیں گھر کو جلانے والے

تم رہو شوق سے محلوں میں مگر
ہم کو بھی زیرِ فلک رہنے دو

کسی مزدور کا پھر گھر نہ جلا ہو شاید
پاس جاکر ذرا دیکھو یہ دُھواں کیسا ہے

ظالم کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں ہر دم
مظلوم کی ہم لوگ حمایت نہیں کرتے

بنگلوں کے چراغاں سے کچھ کام نہیں ہم کو
راہوں میں اندھیرا ہے، ہم دیپ جلادیں گے

شہر میں روز جلتے ہیں گھر
اس لیے گھر بنایا نہیں

جو گم ہوگیا ہے نگر ، ڈھونڈتے ہیں
ہم اُجڑا ہوا اپنا گھر ڈھونڈتے ہیں

ظلم کا نام زمانے سے مٹانے کے لیے
بڑھ کے خود ہاتھ میں تلوار اُٹھالو اخترؔ

ہم جانتے ہیں کہ اُردو شاعری کی اصناف میں غزل ایک ایسی صنف ہے جو بین الاقوامی ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہے اور اس لحاظ سے احتشام اخترؔ کی غزل گوئی بھی اسی خصوصیت کی ضامن ہے۔ان کی شاعری میں مساوات کا جذبہ ہے،فرقہ پرستی سے نفرت ہے، انسان دوستی ہے اور آپسی اتفاق ہے۔ محبت ان کا مذہب ہے وہ ایسی زندگی کو لعنت قرار دیتے ہیں جہاں نفرت کا دور دورہ ہو۔ان کی نظر سیاست پر ہے، سماج پر ہے اور سماج میں ہورہے ظلم و جبر کو بھی وہ محسوس کرتے ہیں۔غرض یہ کہ وہ محض حسن و عشق کی وارداتِ قلبی یا محرومی و ناکامی تک ہی محدود نہیں ہیں۔اور اس کا ثبوت یہ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میں فسادات سے پہلے جسے چھوڑ آیا تھا
تم بتاؤ تو سہی میرا مکاں کیسا ہے

میرا بھی گھر تھا شہر میں نذرِ سیاست ہوگیا
اب راکھ کے اک ڈھیر کو اپنا مکاں کیسے کہوں

نہ اب وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے
جدھر دیکھئے بس دُھواں ہی دُھواں ہے

کھنڈر ہی کھنڈر ہیں کھنڈر کے سوا اب
نگاہوں میں کوئی نظارہ نہیں ہے

مل کر نہیں رہتے کبھی اس دیش کے واسی
آتے ہیں جو نزدیک تو ہوتے ہیں جدا اور

اک حسیں شہر کو شمشان بنانے والے
میرے اپنے ہی تو تھے آگ لگانے والے

اپنی منزل کا پتہ بھول گئے ہیں ہم لوگ
ہیں کہاں آج ہمیں راہ دکھانے والے

شہر والوں کا ہے دستور نرالا اختر
گھر جلاتے ہیں یہاں گھر کو بنانے والے

ہم سب نے یہاں مل کر جس گھر کو بنایا ہے
ہم اپنے ہی ہاتھوں سے اس گھر کو گرادیں گے

شہر میں روز جلتے ہیں گھر
اس لیے گھر بنایا نہیں

شہر میں سب پریشان ہیں
ایک اختر ہی تنہا نہیں

دھرتی کے کچھ جیالے سپوتوں نے آج کل
جھگڑا کھڑا کیا ہے زمینوں کے درمیاں

خود کو بچائیں یا کہ بچائیں مکان کو
جلتا ہوا مکاں ہے مکینوں کے درمیاں

ان اشعار میں جذبوں کی شدت کے ساتھ تلخیِ حقائق، قومی وملکی مسائل کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ احتشام اختر کا سیاسی وسماجی شعور بیدار تھا۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے وطن سے محبت اور عقیدت کا اظہار بھی خوب کرتے ہیں اور ان کے وطن پرست احساسات وجذبات قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

پیاری ہے مجھ کو ماں کی طرح یہ زمین بھی
اس سے ملا ہے پیار وہی جو کہ ماں میں تھا

پھر کچھ پریشان ہوکر یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ:

خوشبو نہ ہو جس میں اُسے میں گلستاں کیسے کہوں
الفت نہ ہو جس جا اُسے ہندوستاں کیسے کہوں

○ باب چہارم:
احتشام اختؔر کی نظم نگاری 89

○ باب پنجم:
راجستھان میں اُردو شاعری میں احتشام اختؔر کا مقام 111

○ باب ششم:
انتخابِ کلام 123

● کتابیات: 143

○○

مل کر نہیں رہتے کبھی اس دیش کے واسی
آتے ہیں جو نزدیک تو ہوتے ہیں جدا اور

ظلم کا نام زمانے سے مٹانے کے لیے
بڑھ کے خود ہاتھ میں تلوار اُٹھا لو اختؔر

طنز اُردو شاعری کا ابتدا سے ہی ایک خاص وصف رہا ہے اور واعظ، زاہد، ناصح، مولوی اور پجاری وغیرہ پر طعن و تشنیع کرنا شعرا کا موضوعِ خاص۔ طنز اُردو شاعری کی ایک مشکل صنف ہے جسے برتنے کا ہنر کم ہی لوگوں کو آتا ہے۔ احتشام اختؔر کی غزلوں کا بغور مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں کہیں ان کے اشعار میں طنز کی کاٹ بہت تیز ہے:

پتھر کی طرح بن گئے پتھر کے پجاری
یاں کچھ نہ ملے گا تمھیں پتھر کے سوا اور

جنت کے فقط خواب دکھاتا ہے یہ ملاّ
پر ہم کو یہاں چاہیے خوابوں کے سوا اور

حاکم کو بُرا کہنے کی جرأت نہیں کرتے
ماحول سے ہم لوگ بغاوت نہیں کرتے

پیسے والے نیند سے محروم ہیں
جھونپڑی میں سو رہے ہیں آدمی

جستجو میں عیش کی اختر یہاں
اپنا سب کچھ کھو رہے ہیں آدمی

سونے کی طرح لگتا ہے پیتل بھی اب یہاں
پتھر چمک رہا ہے نگینوں کے درمیاں

شورِ ہستی میں نہیں سنتا کسی کی کوئی
اپنی آواز کی لو اور بڑھاؤں گا میں آج

اس طرح کے اشعار اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انھوں نے (احتشام اختر) ہر موضوع کو بڑے فنکارانہ انداز میں برتا ہے۔ کہیں بھی ان کے اشعار کی تاثیر میں کمی نہیں آئی ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو موصوف نے جس سادگی اور خلوص سے بیان کیا ہے، یقیناً اس سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے اور ان کی انفرادیت کا اعتراف مختار شمیم نے بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

''میں آپ کی شاعری کا مداح ہوں، اور عرصہ سے آپ کی تخلیقات رسائل میں دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ اپنی تخلیقات میں آپ نے متوازن رویہ اختیار کیا ہے اور یہی کامیاب شاعر کی دلیل ہے۔ ذات و کائنات کے مابین شعر جن رشتوں کو استوار کرتا ہے وہ فنکار کی ابدیت کے ضامن بنتے ہیں۔ یقیناً آپ ایک کامیاب شاعر ہیں اور اس دَور کے چند ناموں میں سے ایک نام ہے احتشام اختر۔''

(''صبح کا ستارہ'' ص ۱۵۷۔ مختار شمیم اندور)

احتشام اختؔر اپنی سوچ کے تنہا شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے جذبے میں فکر کو شامل کیا اور اس طرح اپنے شعروں میں تہہ داری پیدا کی۔ احتشام اختؔر کا اسلوب بھی اپنے ہم عصر شعرا سے الگ ہے۔ اسلوب اک ایسی صنعتِ شعر ہے جو فنکار کی شخصیت کو الفاظ کے ذریعے متعارف کرتی ہے۔ ہر عہد میں فنکار نئے اسلوب کی تلاش میں رہتا ہے، جو اس کی انفرادت کی پہچان بنتا ہے۔ دراصل اسلوب کے ذریعے ہم کسی بھی شاعر کی شخصیت کا، اس کے اظہار کی ٹیکنیک کا اور اس کے اظہار کی انفرادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شاید اسی لیے ''بوفان'' نے اسلوب کو شخصیت کا اظہار بتایا ہے تو ایمرسن کے نزدیک اسلوب فنکار کے ''ذہن کی زبان'' ہے اور نورالحسن نقوی، اطہر پرویز، نثار احمد فاروقی، آل احمد سرور وغیرہ نے اسلوب کو فنکار کی انفرادیت قرار دیا ہے۔ (نئے زاویے، رفعت اختر۔ ص ۳۲) اندازِ بیان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اسلوب اور اندازِ بیان میں احساس کی شدّت، ادبی خلوص، طرز فکر اور تاثیر سب ہی عناصر کسی بہترین اسلوب کو تعمیر کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے جب ہم احتشام اختؔر کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کے یہاں وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو اچھے اور کامیاب اسلوب کی پہچان ہے:

محسوس ہو رہا ہے کہ صدیاں گزر گئیں
حالانکہ ہجرِ یار ابھی کل کی بات ہے

اسی اُمید پر فٹ پاتھ پر سوتے رہے برسوں
کبھی اس شہر میں اختؔر ہمارا بھی مکاں ہوگا

آواز دلوں کی کوئی سنتا نہیں اختؔر
کچھ دل نے کہا اور ہے اور ہم نے کیا اور

غبارِ وقت کے مانند اُٹھ کے بیٹھ گئے
کہاں تلاش تجھے ہم بھی کو بہ کو کرتے

صداؤں کے جنگل میں جو کھو گئے ہیں
نہیں مل سکیں گے ، مگر ڈھونڈتے ہیں

یہ مانا کہ تجھ بن گزارا نہیں ہے
مگر جان دینا گوارا نہیں ہے

تری یاد تو دل میں بیٹھی ہے جم کر
کئی سال سے اس نے ڈالے ہیں ڈیرے،

اپنے اعزاز و تجمل میں نہ کمتر ہوتا
میں اگر دشت نہ ہوتا تو سمندر ہوتا

مذکورہ بالا یہ تمام اشعار احتشام اختؔر کے اچھے اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔اسی طرح ان کی غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی پیکر تراشی ہے۔پیکر سازی کا عمل انسانی ذہن کا فطری عمل ہے۔''پیکریت'' کے معنی لفظوں کی مدد سے تصویر بنانے کا عمل ہے یعنی "Imagery is a picture of words" (نئے زاویے، رفعت اختر) شمس الرحمٰن فاروقی پیکر سازی کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر وہ لفظ جو حواسِ خمسہ میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کو متوجہ اور

متحرک کرے، پیکر ہے، یعنی حواس کے اس تجربے کی وساطت سے ہمارے متخیلہ کو متحرک کرنے والے الفاظ پیکر کہلاتے ہیں۔''

(شعر غیر شعر اور نثر، ش۔ر۔ فاروقی، ص ۳۵)

ہم احتشام اختر کی غزلوں میں اگر پیکر نگاری کی مثال تلاش کریں تو ہمیں ان کی غزلوں میں بعض اچھی مثالیں مل جاتی ہیں جہاں انھوں نے اپنے اشعار میں احساسات کو خوبصورت پیکر میں تراش کر نظر کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

اثر ذرا بھی نہیں ہوتا اس پہ غم کا کبھی
کوئی بھی رُت ہو وہ چہرہ کھلا ہی رہتا ہے

ہوئی جو بارشِ غم تو بدل گئے منظر
ذرا سی دیر میں کیا کیا دکھا گیا پانی

چڑھا ہوا تھا جو دریا اُتر گیا، لیکن
ہماری اونچی عمارت کو ڈھا گیا پانی

دلِ تباہ میں رنگینیِ خیال کہاں!
لدی ہوئی تھی جو پھولوں سے اب وہ ڈال کہاں

اجاڑ دشت کی مانند روز و شب ہیں مرے
بکھیریں سانس میں خوشبو وہ ماہ و سال کہاں

مجھے اب دھوپ کی شدّت بھلا کیسے ستائے گی
مرے سر پر تو سایہ ہے حسیں سرسبز پیڑوں کا

خون کے دھبے نہیں مٹتے میاں
دیکھو کب سے دھو رہے ہیں آدمی

پاس تھا جب تو چمک کچھ بھی نہ تھی
دور جاکر وہ تو اختر ہوگیا

احتشام اختر کے کلام میں ایک فرق اور واضح طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ رنگِ سخن اور اسلوبِ بیان کی زیریں سطح میں ہندی الفاظ کی کارفرمائی ہے۔ یہ کارفرمائی کبھی روزمرّہ زبان کی شکل میں نظر آتی ہے کبھی تشبیہات و استعارات کے استعمال کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے، اور کہیں اندازِ بیان کی صفائی میں نظر آتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ حتی الامکان گراں مشکل الفاظ اور ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں اور خالص ہندوستانی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ مثال کے لیے ان کی ایک پوری غزل دیکھیے:

تمھیں ارپت یہ مرے شعر میری کلپنا کے ہیں
کہ جیسے آرتی میں پھول یہ آرادھنا کے ہیں

تمھیں کیسے بتاؤں دل میں میرے زخم کیسے ہیں
حسیں من موہنی مورت کے یہ استھاپنا کے ہیں

نرک تم جس کو کہتے ہو جسے تم سورگ کہتے ہو
میاں یہ سب کرشمے تو ہماری کلپنا کے ہیں

مری غزلوں مری نظموں میں سارے عشق کے قصّے
کسی دلبر کو پانے کی ادھوری کامنا کے ہیں

یہ دنیا ہے یہاں غم اور خوشی میں فرق کرنا کیا
یہ سارے کھیل تو اختؔر ہماری بھاؤنا کے ہیں

اور صرف یہی غزل نہیں ہے جس میں احتشام اختؔر نے متعدد ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں بلکہ ایسے کئی اشعار ہمیں مل جائیں گے جہاں انھوں نے ہندی کے الفاظ کافی تعداد میں پیش کیے ہیں۔ اسی نوعیت کے ان کے کچھ اور اشعار دیکھیے:

اس کا تو چلن اختؔر راون سے بھی بدتر ہے
کیوں اس کو جہاں والے بھگوان سمجھتے ہیں

پی لیا تیرے پیار کا زہر اب
مجھ کو شنکر بنا دیا تونے

دل کے ویران آکاش میں
یاد کا کوئی تارا نہیں

نگاہیں ڈھونڈتی ہیں زندگی کے مدبھرے سپنے
حقیقت سے کوئی کہہ دے کہ اپنا روپ دکھلائے

جلا کر دل کے مندر میں نئی آشا کا اک دیپک
پجارن دیوتا کے سامنے رہ رہ کے مسکائے

اور اس طرح کے اشعار کو دیکھتے ہوئے دیا کرشن وجے ایک تبصرے میں لکھتے ہیں:

''.....شری احتشام اختر بنیادی طور پر اُردو کے شاعر ہیں لیکن آپ کے خیالات میں کٹر وادی کٹھ ملاپن نہیں ہے۔ آپ اپنی بات عام فہم زبان میں یعنی ہندوستانی زبان میں کہتے ہیں.....شاعری کے ذریعے اپنا اظہار کرنے والے اختر سوچ کے دھراتل پر بہت گہرے ہیں۔''

(سابق صدر راجستھان ساہتیہ اکادمی تبصرہ ''راکھ'' ''نیلا آکاش'' میں ص ۱۰۹ پر
(کوٹہ کا ویہ گندھا سے اُردو میں ترجمہ)

مجموعی اعتبار سے احتشام اختر کی غزل گوئی خلوص اور جذباتی وفور کی بنا پر کامیاب شاعری ہے۔ وہ اپنی کچھ کمزوریوں کے باوجود ایک کامیاب شاعر ہیں اور زبان و بیان اور اظہارِ مطالب پر انھیں بے مثال قدرت حاصل ہے۔

احتشام اختر کی غزلوں میں ان کی زبان کی سادگی اور سلاست کا غیر معمولی رول ہے چونکہ ''انسان کو انسان سے جوڑنے والی چیزوں میں زبان کو مقدم حیثیت حاصل ہے۔ زبان ہی سب سے پہلے زندگی کا پیغام لے کر فضاؤں میں وارد ہوئی۔ زبان کا وجود ہماری فضاؤں میں تہذیب کی روشنی سے بھی پہلے ہے۔'' احتشام اختر نے بھی اپنی غزلوں میں جو زبان استعمال کی ہے وہ سادہ اور مانوس ہے جو ان کے مزاج کی سادگی کی دلیل ہے۔ بعض شعرا تخلیقی توانائی کے اظہار میں زبان کی تراش خراش یا نئی لفظیات کے استعمال کو ناگزیر سمجھتے ہیں اس کے برعکس احتشام اختر کی خوبی یہ ہے کہ وہ مانوس اور سادہ زبان سے جو پیکر تراشتے ہیں وہی ان کی تخلیقی صلاحیت کا مظہر بنتی ہے اور ان کے اسلوب کو بھی دل پذیر بناتی ہے۔ مثلاً:

اس قدر سخت سزا دی کس نے
میری پہچان مٹا دی کس نے

اب تو مرنا بھی ہوا ہے مشکل
مجھ کو جینے کی دعا دی کس نے

وہ مرے پاس نہیں ہے لیکن
اس کے ہونے کا گماں ہے اب بھی

میں تعلق سے پرے ہوں ، لیکن
مجھ سے وابستہ جہاں ہے اب بھی

پیار کے نقش مٹاؤں کیسے
دل کی دیوار گراؤں کیسے

احتشام اختر کی غزلوں میں محبت کا ایک پاکیزہ رشتہ ملتا ہے۔ جس میں درد، کسک، جدائی اور غم کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے یہاں والہانہ پن ہے مگر وہ کہیں بھی بھدّے اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ ان کے اشعار میں کہیں بھی عامیانہ پن نظر نہیں آتا ہے اور اس کی وجہ ہے ان کے الفاظ کو استعمال کرنے کی صلاحیت ہے۔ کیونکہ الفاظ کا آرٹ ایسا آرٹ ہے جسے فن کا درجہ حاصل ہے، اور احتشام اختر اس فن میں ماہر ہیں۔ ان کے یہاں بنیادی طور پر جو الفاظ زیادہ تر استعمال ہوتے ہیں ان میں مکانِ دل، دشت، دریا، گھر، آسمان اور دل وغیرہ الفاظ استعارے کے طور پر استعمال ہوئے

ہیں۔اور اسی لیے ان کی شاعری دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کرتی ہے۔کلیدی طور پر جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

طوفانی صداؤں سے کمروں کو سجائیں گے
دریا کے کنارے ہم گھر اپنا بنائیں گے

اب دل کے بہلنے کی بس ایک ہی صورت ہے
مٹی کے گھروندوں کو توڑیں گے بنائیں گے

دریا ہی میں گھر ہے میرا
پھر بھی دریا سے ڈرتا ہوں

چراغ دل کا تھا روشن بجھا گیا پانی
کہ بن کے سیلِ بلا گھر میں آ گیا پانی

تازہ کاری کی یہ مثالیں ان کے کلام کی زینت کو بڑھا دیتی ہیں اور اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے عشرت ظفر ''صبح کا ستارہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احتشام اختر نئی نسلوں کے شعرا میں اس نقطۂ نظر سے ممتاز ہیں کہ ان کے یہاں الفاظ کے برتنے کا منفرد سلیقہ ہے.....الفاظ ان کے راز دار ہوتے ہیں اور کشفِ معانی کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے۔''

دیباچہ

راجستھان کی جدید شاعری کو جن شعراء کے کلام سے معنویت حاصل ہوئی ہے، اُن میں ایک نمایاں نام پروفیسر احتشام اختر کا بھی ہے۔

پروفیسر احتشام اختر گذشتہ چار دہائیوں سے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ میدانِ شاعری میں سرگرمِ عمل ہیں۔ اس مدّت میں اُن کے متعدّد شعری مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے ہیں۔ رومان اور حقیقت کے درمیان امتزاج اُن کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ وہ عصری تحریکات سے بھی متاثر ہوئے ہیں، لیکن جدیدیت کی لائی ہوئی بے راہ روی سے اُن کا کلام ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ اُن کے لہجے میں شگفتگی ہے اور وہ فن کی باریکیوں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ہندی لفظیات سے بھی انھوں نے خاطرخواہ فائدہ اُٹھایا ہے۔ راجستھان کی جدید شاعری کے مطالعے میں احتشام اختر کی خدمات ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

مقامِ خوشی ہے کہ احتشام اختر کی شعری خدمات کا ناقدانہ مطالعہ میری شاگردہ انجم آفاق کے حصّے میں آیا۔ ایم فِل (اُردو) کی ڈِگری کے لیے لکھا گیا یہ مقالہ جواب کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ رہا ہے، اگرچہ ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہے۔ ماہ و سال کی پابندی کے سبب اور پھر امتحانی ضرورت کی وجہ سے قارئین کو اس میں ممکن ہے کہ خامیاں نظر آئیں، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ انجم آفاق نے انتہائی دیانت داری کے

احتشام اختؔر کی غزلوں میں صنعتوں کا استعمال بھی خوب ہوا ہے۔ ان کی شاعری تشبیہات سے مزّین ہے۔ تشبیہات واستعارات اُردو شاعری کی وہ صنعتیں ہیں جو ابتدا سے اُردو شاعری کا ایک اہم حصّہ رہی ہیں اور غالبؔ، میرؔ اور مومنؔ جیسے بلند پایہ شاعروں سے لے کر آج تک اُردو شعرا ان صنعتوں کو اپنے اشعار میں طرح طرح سے پیش کرتے رہے ہیں۔ احتشام اختؔر کے یہاں اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

جب ندی شب کی جواں ہوتی ہے
ناؤ خوابوں کی چلا دیتا ہوں

مجھے مٹانے کی کوشش فضول ہے یارو!
میں مثلِ موجِ صدا ہوں، مجھے زوال کہاں

دل میں چبھتے تھے وہ کانٹوں کی طرح
جسم تھا جن کا گلابوں کی طرح

ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیں جو صنعتِ تلمیح کی ایک اچھی مثال ہے:

کربلا ہم نے بھی دیکھی ہے میاں
زندگی کاٹی ہے پیاسوں کی طرح

جہاں ہم نے احتشام اختؔر کی غزل گوئی کی تمام خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے وہیں ان کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کے سہلِ ممتنع کے اشعار ہیں۔ سہلِ ممتنع کو ہمیشہ

سے اعلیٰ ترین شاعری میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کی ایک پہچان یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اس کی نثر نہیں ہوسکتی۔ اور اگر ہم سہلِ ممتنع شاعری کی مثالیں تلاش کریں تو ہمیں میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ سے لے کر دورِ جدید کے احتشام اخترؔ تک کے کلام میں ایسے اشعار بآسانی مل جائیں گے جو سہلِ ممتنع شاعری کی بہترین مثال قرار دیے جاسکتے ہیں۔ غالبؔ اور مومنؔ جیسے فنکاروں کے یہاں سہلِ ممتنع کی مثالیں دیکھیں:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(غالبؔ)

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

(غالبؔ)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومنؔ)

مذکورہ بالا اشعار ایسے ہیں جن کی اگر ہم تشریح کریں تو بھی ہم وہی الفاظ دُہراتے نظر آئیں گے جو ان اشعار میں ہیں اور اس لحاظ سے ایسے اشعار احتشام اخترؔ کی غزلوں میں دیکھے جائیں تو کافی تعداد میں ہمیں مل جائیں گے۔ مثلاً:

منہ سے آواز نکلتی ہی نہیں
جانے والے کو بلاؤں کیسے

مشغلہ اب تو یہی ہے میرا
نام لکھتا ہوں ، مٹا دیتا ہوں

بہت کچھ کھو دیا ہے اس جہاں میں
مگر پھر بھی یہاں پایا بہت ہے

احتشام اختر کی غزلوں کے مجموعے ''صبح کا ستارہ'' میں بیشتر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں اور سہلِ ممتنع کی اچھی مثالیں ہیں۔ان کے یہاں غزلیں طویل نہ ہو کر صرف پانچ چھ شعروں کی ہوتی ہیں لیکن ان مختصر سی غزلوں میں بھی وہ اپنے احساسات اور جذبات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ان کی اسی خصوصیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مختار شمیم نے ایک تبصرے میں لکھا ہے:

''احتشام اختر سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ان کی غزلیں صرف پانچ چھ شعروں پر ہی مشتمل ہوتی ہیں۔لیکن ان غزلوں میں جذبہ و احساس اور فکر و فن کے دھنک رنگ کچھ اس امتزاج سے در آتے ہیں کہ ان کی شاعری کا اُفق وسیع اور روشن نظر آتا ہے۔''

(ہفت روزہ ہماری زبان دہلی ۱۵ر جنوری ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر مختار شمیم کی رائے کو ہم مثال کے ذریعے ثابت کرنا چاہیں گے، لہٰذا چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

ہوسِ خام لیے پھرتے ہیں
دلِ ناکام لیے پھرتے ہیں

عشقِ گلفام کے آغاز میں ہم
اپنا انجام لیے پھرتے ہیں

ہم سے یاروں کو شکایت ہے یہی
ہاتھ میں جام لیے پھرتے ہیں

عشق کی اپنے حقیقت یہ ہے
سر پہ الزام لیے پھرتے ہیں

ہم حسینوں کی گلی میں اختؔر
دل کا پیغام لیے پھرتے ہیں

زندگی راز ہوئی جاتی ہے
تیری آواز ہوئی جاتی ہے

بزمِ اغیار میں اک تیری نظر
دل کی ہمراز ہوئی جاتی ہے

زندگانی کی یہ بیگانہ روش
تیرا انداز ہوئی جاتی ہے
اب تو میرے لیے تیری ہستی
دور کا ساز ہوئی جاتی ہے

مذکورہ دونوں غزلیں اس بات کی دلیل ہیں کہ احتشام اختؔر نے پانچ چھ اشعار کی مختصر ترین غزلوں میں بھی غزل کی نزاکت اور نفاست کو برقرار رکھا ہے اور اسی لیے ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب جیسا باند مرتبہ اور معزز ناقد بھی ان کی تعریف کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''احتشام اختؔر کی غزلیں عموماً صرف پانچ چھ شعروں کی ہوتی ہیں اور ان کے کلام کے مجموعے بھی مختصر ہوتے ہیں لیکن ان کے بارے میں ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کی مثل صادق آتی ہے۔''

اس باب میں ہم نے احتشام اختؔر کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ احتشام اختؔر راجستھان کے چند مشہور و معروف غزل گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں انھوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں مگر ان کی غزلیں زیادہ خوبصورت اور مؤثر ہوتی ہیں اور اسی لیے بشیر بدؔر صاحب ان کے لیے لکھتے ہیں:

''وہ غزل کے شاعر ہیں اور ان کے مزاج میں غزل کی پُرسوز اور مہذّب داخلیت رچ بس چکی ہے۔ لفظوں کی مزاج شناسی اور انھیں تخلیقی انداز سے برتنے کا فن انھیں خوب آتا ہے.....''

(ماہنامہ آج کل نئی دہلی، شمارہ نمبر ۳ جلد ۴۵، اکتوبر ۱۹۸۶ء، صفحہ نمبر ۴۶)

OO

باب چہارم

احتشام اختؔر
کی نظم نگاری

○

پچھلے ابواب میں ہم احتشام اختر کے حالاتِ زندگی، ان کے ہم عصر شعرا، ان کی غزل گوئی کا جائزہ لے چکے ہیں۔ زیرِ نظر باب میں ہمارا مقصد احتشام اختر کی نظم نگاری کا جائزہ پیش کرنا ہے۔

نظم یوں تو صنفِ غزل کے مقابلے نئی ہے لیکن پھر بھی اُردو شاعری کی تمام دیگر اصناف کے مقابلے اپنی انفرادیت پر قائم رہنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ آج جبکہ نثر کا زمانہ ہے اس کے باوجود بھی جدید اُردو نظم دنیا کے ادب میں اپنا مقام بناتی جارہی ہے۔ راجستھان میں متعدد شعرا اس صنف کی خدمت کررہے ہیں۔

احتشام اختر نے پابند نظموں کے مقابلے آزاد نظم اور نثری نظم زیادہ لکھی ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک شعری مجموعہ ''نیلا آکاش'' کے نام سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ بیشتر آزاد اور نثری نظموں پر مشتمل ہے۔ اُردو میں نظمِ معرّیٰ اور آزاد نظم کی ابتدا عبدالحلیم شرر کے ''دلگداز'' سے ہوگئی تھی، اور ترقی پسند تحریک کے دور میں اسے استحکام نصیب ہوا اور یہ باقاعدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے معروف ہوگئی۔ لیکن ہمارے نقّاد نثری نظم کو ایک صنفِ سخن کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے آج بھی تیار نہیں۔ اس اعتبار سے راجستھان میں احتشام اختر نے روایتی اور پابند نظموں سے انحراف کرتے ہوئے نثری نظمیں لکھیں اور اس طرح اجتہاد کیا۔ اس سلسلے میں ان کی رائے اُن اُردو نقّادوں سے مختلف ہے جو نثری نظم کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے۔ چنانچہ احتشام اختر کا کہنا ہے کہ جب ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب میں نثری نظم کی روایت مستحکم

ہو چکی ہے اور ہندی کے ہر بڑے شاعر جیسے ملک بودھ اور اگیے وغیرہ نے بڑی تعداد میں نثری نظمیں لکھی ہیں تو پھر اُردو والوں کو اس سے پرہیز کیوں۔ اور جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے، انھوں نے اس صنف کو اتنی سنجیدگی سے اختیار کیا کہ نثری نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ الگ سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ادبی و علمی حلقوں میں اتنا مقبول ہوا کہ مجموعے کی ساری کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ نثری نظموں پر کیے گئے نقادوں کے اعتراضات کے بارے میں ڈاکٹر رفعت اختر نے لکھا ہے:

''نثری نظم کی ترکیب پر اعتراض کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ نثر کی ضد نظم نہیں بلکہ شعر ہے کیونکہ علمائے ادب اور ناقدینِ ادب اس بات پر متفق ہیں کہ شاعری کے لیے ردیف قافیہ اور بحر کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے لیے ایک مخصوص آہنگ اور طرح داری کی ضرورت ہوتی ہے۔''

(مضمون ''نثری نظم اور اس کے مضمرات'' مشمولہ ''نئے زاویے'' از رفعت اختر، ص ۸۷)

رفعت اختر نے ''مخصوص آہنگ'' کی وضاحت نہیں کی۔ دراصل نثری نظم کے مصرعوں کے اندرونی ربط اور ترتیب ہی سے اس کا آہنگ پیدا ہوتا ہے اور یہ بحر اور ارکان کے آہنگ سے مختلف ہوتا ہے لیکن ایک آہنگ ہونا بہر حال ضروری ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم احتشام اختر کی نثری نظموں کا جائزہ لیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نثری نظم کی ہیئت اور اس کی ابتدا اور دیگر زبانوں میں بطورِ صنفِ سخن اس کی کیا نوعیت ہے، ان پہلوؤں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ نثری نظمیں بھی آزاد نظم، سانیٹ اور لمبرک وغیرہ کی طرح مغرب کی دین ہے۔ مغرب میں نثری نظم کے ارتقائی سفر کے بارے میں ڈاکٹر رفعت اختر لکھتے ہیں:

''مغرب میں نثری نظم کے ارتقائی سفر کے قریب ڈھائی سو برس گزر چکے

ہیں۔ یہاں Prose Poems کی ایک ارتقا پذیر تاریخ رہی ہے۔
الویس برٹینڈ نے سب سے پہلے ۱۸۴۲ء میں نثری نظمیں لکھنا شروع کیں
فرانسیسی شاعر غینی لون اور مان تسقی نے بالترتیب ۱۶۹۹ء اور ۱۷۲۵ء میں
کامیاب مجموعے شائع کیے۔ ملارمے، بادلیر، ریّن بو نے نثری نظموں کو
خصوصی توجہ دی۔ فرانسیسی میں معرّیٰ نظم کو ''شاعرانہ نثر'' اور ''ورس لبرے''
سے علیحدہ صنفِ شعر سمجھا گیا۔''

(''نثری نظم اور اس کے مضمرات''، ''نئے زاویے'' از رفعت اختر، ص ۸۶)

گلاٹو کے مطابق نثری نظم کا بنیادی وصف مندرجۂ ذیل ہے:

"One of the fundamental qualities of the prose
poem is its ability to retain its an accidental
nature, its uncontrolable novelty.

(Modernism, P.351)

نثری نظم کو انگریزی میں Prose Poems کہتے ہیں لیکن ہمارے یہاں نثری نظم کی اصطلاح کی متعدد نقّادوں نے مخالفت کی ہے۔ اس لیے کچھ ناقدین نے اسے ادبِ لطیف یا نثرِ لطیف کا نام دیا یا کسی نے نثری شاعری کہا جسے ہم نثر میں شاعری کہہ سکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

قافیہ کی ناگزیریت ختم ہو چکی ہے۔ اب لازم ہے کہ وزن اور بحر کی
ناگزیریت کو ختم کیا جائے اور شاعر فکرِ محسوس کی توانائی اور دلکشی کے بل پر
شعر میں جادو جگائے۔ وزن اور بحر کا سہارا نہ لے۔''

(جدید اُردو ادب، ص ۱۱۲)

ڈاکٹر محمد حسن کی مندرجہ بالا رائے درست ہے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم قافیہ کے استعمال سے بالکل پرہیز کریں بلکہ نثری نظم میں قافیہ کا استعمال کیا جا سکتا ہے اور ہوا بھی ہے۔ نثری نظم کے مصرعوں کی ترتیب آزاد نظم کے مصرعوں کی طرح ہی ہوتی ہے لیکن اس میں وزن اور بحر کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایجاز و اختصار نثری نظم کی جان ہیں۔ اس میں کم سے کم مصرعوں میں اپنا مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے احتشام اختؔر کی نثری نظمیں اس کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں۔ جیسا کہ آزاد گلاٹی نے احتشام اختؔر کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''نثری نظم کے مزاج کو آپ نے خوب سمجھ کر یہ نظمیں کہی ہیں اور وہ مخصوص آہنگ جو نثری نظم میں ہونا لازمی ہے اور جو اسے نثر سے الگ صنف بناتا ہے ان میں موجود ہے۔'' (خط بنام احتشام اختؔر)

احتشام اختؔر کی نظم نگاری کے بارے میں آزاد گلاٹی کا یہ بیان بالکل درست ہے۔ ان کی نظموں میں اظہار خوبصورت اور مؤثر انداز میں ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں حسن و عشق کی چاشنی ہی نہیں ملتی بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس بات کے پیشِ نظر ظفر ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''احتشام اختؔر نے اپنی مختصر نظموں میں زندگی کی تلخیوں، ناکامیوں، حسرتوں اور مایوسیوں کو بڑے خوبصورت اور مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔'' (تبصرہ ''نیلا آکاش''، ''گلبن'' احمد آباد از سیّد ظفر ہاشمی)

اس بات کے پیشِ نظر احتشام اختؔر کی نظم ''مشورہ'' ملاحظہ فرمایئے:

اپنا عکس آئینے میں سجاؤ
خواہش کو اپنی اطلسی بستر پہ سلاؤ

ساتھ احتشام اختؔر کی شاعری کا مطالعہ مختلف ابواب میں کیا ہے۔ وہ احتشام اختؔر کی شخصیت سے زیادہ اُن کے کلام پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہیں اور ایسے اشعار سے استنباط نتائج کرتی ہیں جو احتشام اختؔر کے فکروفن کی تفہیم میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا اسلوب بھی دلکش اور متاثر کُن ہے۔ یہ اُن کی پہلی کاوش ہے۔ اُمید ہے کہ اُن کی اس ابتدائی کوشش سے احتشام اختؔر کی شعری خدمات کی تفہیم میں یقیناً مدد ملے گی۔

——— پروفیسر فیروز احمد
صدر شعبۂ اُردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی، جے پور

کاغذ کے ٹکڑوں سے بازار خرید لاؤ
پاس بک کے ہندسوں کو بڑھاؤ
شور مچاؤ چلاؤ
جو جی میں آئے کر ڈالو
لیکن
وہ شے تلاش نہ کرو
جو موت کی جاگیر ہے
جو زندگی کو نہیں مل سکتی

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، ایجاز و اختصار نثری نظموں کی جان ہے۔ احتشام اختر کی نثری نظمیں اس کی مثال ہیں۔ ان کی زبان عام فہم ہے۔ اور عموماً بول چال کا انداز ہر نظم میں موجود ہے۔ اور یہی خوبی نثری نظموں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ اس کی مثال کے لیے ان کی ایک نظم ''ہم لوگ'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

کیڑے مکوڑوں کی طرح
ہم مسل دیے گئے
لیکن ہم پھر پیدا ہو گئے

مندرجہ بالا اقتباس ایجاز و اختصار کی مثال تو ہے ہی مگر اس میں موجودہ سماج کے حالات پر ایک طنز بھی پوشیدہ ہے۔ اسی انداز کی ان کی ایک اور نظم ''جسارت'' ملاحظہ فرمائیں جس میں طنز بھی ہے اور ایجاز و اختصار کی بہترین مثال بھی:

سر جھکا کر چلتی ہوئی بھیڑوں کی قطار
اندھے کنویں میں گر گئی

میں بچ گیا
میں نے قطار سے الگ ہونے کی
جسارت کی تھی

'ہم لوگ' اور 'جسارت' جیسی نظموں کے قبیل کی متعدد دوسری نظموں سے ان کا شعری مجموعہ ''نیلا آ کاش'' بھرا پڑا ہے۔ آزاد گلاٹی نے ساہتیہ اکیڈمی کے زیر نگرانی شائع ہونے والے دو ماہی انگریزی رسالے Indian Literature کے شمارہ نمبر ۱۱۰ نومبر- دسمبر ۱۹۸۵ء میں اپنے مضمون بہ عنوان "Poetry and Short Story Dominate" میں ۸۵-۱۹۸۴ء کے سال میں شائع ہونے والی اُردو کی مطبوعات پر تبصرہ کیا ہے۔ اس میں ''نیلا آ کاش'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"Ehatesham Akhtar's 'Neela Akash' is an anthology of prose poems woven round small, sweet wistes and aching deprivations of man. Inspite of the bitter taste of futility of human endeavour, the desire of the moth for the star is never extinguished. He has chiselled his responses to the complexity of human existence in short poems that often a thing of beuaty."

(Indian Literature, No. 110)

احتشام اختر کی نظمیں بحر اور وزن کے فقدان کے باوجود قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ پڑھتے وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ نثری نظم ہے اور وزن و بحر سے عاری ہے۔ ''نیلا آ کاش'' پر تبصرہ کرتے ہوئے طارق کفایت نے لکھا ہے کہ:

قافیہ، ردیف اور وزن و بحر کا سہارا نہ ہوتے ہوئے بھی ''نیلا آ کاش''

جا بجا ایسے نثر پاروں سے مزّین ہے جن میں پابند نظم کی سی گہرائی و گیرائی خوبصورتی اور کشش پائی جاتی ہے۔ الفاظ مختصر ہیں مگر عمیق مشاہدے اور سنجیدہ مطالعے کے شاہد.....'' (پروازِ ادب: پٹیالہ)

احتشام اختر کی نظموں میں سادگی اور سلاست تو ہے مگر یہ سادہ یا سپاٹ نہیں ہیں بلکہ ان میں معنویت اور تہہ داری بھی ہے اور ایک لطیف سا ابہام بھی ہے جو نظم کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال اُن کی نظم ''آرزو'' ہے جو بہت مختصر ہے یعنی چھ مصرعوں پر مشتمل ہے اور جیسا کہ شاکرہ ناز نے اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان نثری نظموں میں شاعرانہ آہنگ اجمال ابہام اور الفاظ کا جدلیاتی استعمال نمایاں ہے۔ یہ عناصر ان نظموں کو نثر سے ایک بالکل علیحدہ حیثیت اور پہچان عطا کرتے ہیں۔ ان میں اجمال نثری نظم میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔''

دشتِ زندگی میں
کاش کوئی مسافر آئے
مجھے ڈھونڈے، مجھے پائے
میں چشمِ آب ہوں
میں زیرِ سنگ ہوں

مندرجہ بالا نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے شاکرہ ناز آگے لکھتی ہیں:

''دشتِ زندگی میں چشمۂ آب کی معنویت عام قاری بھی سمجھ سکتا ہے۔ شاعر اپنی شخصیت میں چھپے ہوئے ان امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے

جن کے ظاہر ہونے پر دشتِ زندگی میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کی پیاس بجھائی جائے گی۔ یہ چشمۂ آب اوپر سے نظر نہیں آتا یہ زیرِ سنگ ہے۔ شاعر کی شخصیت میں جو امکانات پوشیدہ ہیں ان سے فائدہ اُٹھانے کے لیے جستجو اور محنت سے کام لینا ہوگا۔ اگر چہ ان اشعار میں پیش کیا گیا خیال سیدھا اور صاف ہے، پھر بھی یہ ایک گہری معنویت کا حامل ہے۔''

(جدید فکر و فن جلد نمبر ۴۔ شمارہ نمبر ۲۷)

احتشام اختر اپنی نظموں میں ایسی شیریں اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں جو قاری کے دل میں اُتر جاتی ہے اور قاری لفظوں کی بازی گری اور تصنّع سے بچا رہتا ہے اور بآسانی اشعار کے مفاہیم تک پہنچ جاتا ہے۔ سلاست اور روانی کی مثالیں ہم ان کی نثری نظموں میں ہی نہیں بلکہ آزاد نظموں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ''ارادہ'' اور ''خوابوں کا نگر'' کے عنوان سے لکھی گئی دو مختصر نظمیں ملاحظہ فرمائیں تاکہ صورتِ حال واضح ہو سکے:

بلڈنگوں کی اونچائی
رنگ بن کے بکھری ہے
سُرمئی اندھیرے نے
راستے کو گھیرا ہے
ہر دِشا بھیانک ہے
کس دِشا کو جائیں گے
آج میں نے سوچا ہے
کاغذی اصولوں کو
جیب سے نکالوں گا

اور پھاڑ ڈالوں گا (ارادہ)

خوابوں کے ویران نگر میں
پیار کا عالیشان محل ہے
جس میں اب مکڑی کے جالے
پاگل ہو کر
ناچ رہے ہیں (خوابوں کا نگر)

مندرجہ بالا نظموں کی طرح متعدد آزاد نظمیں احتشام اختر کے سحر کار قلم سے تخلیق ہوئی ہیں، جن میں گہری معنویت موجود ہے اور جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ان نظموں میں جذبہ و احساس کی شدت بھی ہے اور فکر و آگہی کی گہرائی و گیرائی بھی۔ مثلاً ان کی نظم ''راکھ جمنے لگی انگاروں پر'' اور ''زخمی صدا کی موت'' (جسے انھوں نے ایک حاملہ محبوبہ کی خودکشی سے متاثر ہو کر لکھی تھی) بے حد معنی خیز ہے۔ دوسری نظم کا پس منظر پہاڑی اور برفانی علاقہ ہے اور نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

اور پھر یوں ہوا
بادلوں سے گھرا آسماں
پربتوں کی اُداسی پہ رونے لگا
اور پھر آندھیاں رُک گئیں
اور وہ حاملہ
جو بلندی سے نیچے گری تھی ابھی
اس کے زخموں سے بہتا ہوا گرم خون
سرد مرجھائے پھولوں پہ جمنے لگا

حاملہ کی صدا
سننے والا وہاں
کون تھا
چند لمحے وہ یوں ہی تڑپتی رہی
کوئی آئے ادھر اس کو دیکھے ذرا
اس کا ساتھی کہاں کھو گیا
وہ کہ جو اس کا دمساز تھا اس کا ہمراز تھا
جس نے اس کو بنایا تھا ماں
خودکشی کا ارادہ تو اس کا نہیں تھا مگر.....!
چند لمحے وہ یونہی تڑپتی رہی
اور پھر اس کی زخمی صدا
بھیگے موسم کے برفیلے ماحول میں
گونج کر مر گئی
اور پھر برف گرنے لگی
برف نے
مرنے والی کا ٹھنڈا بدن ڈھک دیا

یہ نظم دراصل احتشام اختر کے رومانی مزاج اور اُن کی حساس طبیعت کا مظہر ہے اور اب دوسری نظم ''راکھ جمنے لگی انگاروں پر'' بھی یہاں ملاحظہ فرمائیں:

آنکھیں بے خواب ہوئیں
جھیلیں بے آب ہوئیں
کاسۂ دل میں کوئی یاد نہیں
کوئی سوغات نہیں

دستِ خواہش کو میں پھیلاؤں کہاں
خود فراموشی کے اس دور میں مفلس ہیں سبھی
اب مریضوں کو دواؤں کی ضرورت نہ رہی
لاعلاجوں کو دُعاؤں کی ضرورت نہ رہی
محفلیں چاند ستاروں کی سجاتے کیوں ہو
چاند کا نور بھی سورج ہی کی خیرات تو ہے
غم تھا اک گوہرِ نایاب سو پتھر نکلا
اب کوئی درد نہیں درد کا احساس نہیں
اب کوئی پاس نہیں
آتشِ زیست ہوئی جاتی ہے ٹھنڈی دیکھو
راکھ جمنے لگی انگاروں پر

یہ نظم اصلاً دورِ حاضر میں شکست خوردہ اقدارِ حیات کی ترجمان ہے۔ احتشام اختر نے اپنے عمیق مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر جن مسائل کو اس نظم میں پیش کیا ہے وہ انتہائی معنی خیز ہیں اور مصلحین کی فوری توجہ کے محتاج بھی۔ زندگی کے بعض جذباتی پہلو بھی احتشام اختر کی نظموں میں نمایاں ہیں۔ انھوں نے عام انسانی جذبات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں محبوب کی یادیں ہیں، کہیں نوجوانی کی شادمانیاں ہیں، کہیں والد کی یاد ہے، کہیں بہن کی موت کا غم ہے، اور اس قسم کے نازک جذبات ان کی نظموں میں اس قدر شدت سے ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ہم ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ بہن کے انتقال پر انھوں نے جو شخصی مرثیہ لکھا ہے، وہ بہت پُراثر اور دردانگیز ہے اور جذبات نگاری کی عمدہ مثال، ملاحظہ ہو:

شفیق آنکھیں

کہ جن میں میرا ہی عکس اب تک
بسا ہوا تھا
شفیق آنکھیں
کہ دیکھتی تھیں
مری جوانی مرے بڑھاپے کے خواب ہر دم
شفیق آنکھیں کہ جن میں اختر
بسا ہوا تھا
وہ کل، کہ اب جو گذر گیا ہے
وہ کل، کہ جو آنے والا ہے اب
وہ آنکھیں دریا کی تھیں روانی
وہ آنکھیں جھیلوں کی تازگی تھیں
وہ آنکھیں اب کیوں بنی ہیں پتھر
اُداس جھیلوں کی سبز کائی بھی مر نہ جائے
کہ قطرہ قطرہ
ٹپکتی شبنم تو ریگ زاروں میں کھو گئی ہے
حدیں نہ کھینچو، رومال سے تم
کہ میری آنکھیں ندی بنی ہیں
عزیز و مجھ پر کرم یہ کر دو
شفیق آنکھوں میں نور بھر دو

احتشام اختر کے یہاں جو خاص بات دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ غزلوں سے زیادہ رومانیت اور حسن و عشق کی چاشنی ان کی نظموں میں ملتی ہے۔ ویسے بھی وہ طبعاً رومانی شاعر ہیں، لیکن بعض نظموں میں اینٹی رومانی روّیہ بھی ملتا ہے۔ مثلاً ''اجنبی شہر'' اور

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

''سعیِ رائیگاں''، جیسی نظمیں احتشام اختر کی رومانی نظموں میں لطافت اور شگفتگی بھی پیدا کر دیتی ہیں اور جدّت اور تازہ کاری ان پر مستزاد ہے۔ ان نظموں کا اسلوب جدید شعری اظہار کے باعث بہت متاثر کرتا ہے۔ یہی نہیں حسن و عشق کے بدلتے ہوئے تصورات کی عکّاسی بھی احتشام اختر کے یہاں بہت خوبصورت انداز میں ہوئی ہے۔ اس کی مثالیں ان کی دو نظموں ''کوشش'' اور ''خوشی'' سے دی جا سکتی ہیں:

تمھیں بھلانے کی کوشش میں
میں نے
نہ جانے کتنی لڑکیوں سے
جھوٹا پیار کیا ہے

(کوشش)

مجھے اس خبر سے
خوشی ہوئی ہے
کہ میری محبوبہ نے
اب تک شادی نہیں کی ہے
لیکن میں
شادی شدہ ہوں

(خوشی)

لطیف رومانیت سے ہم کنار یہ نثری اور نظمیں قاری کو ایک نئے جہانِ احساس اور معنی سے روشناس کراتی ہیں۔ غرض یہ کہ اُن کے یہاں نظموں میں ہر جذبے اور خیال کی عکّاسی ہوئی ہے۔ انھوں نے مناظرِ فطرت کے ایسے پہلوؤں کو پیش کیا ہے جو عام انسان کے ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث بنتے ہیں اور اسے ایک انوکھی مسرت سے ہم کنار کرتے ہیں۔ ''بارش''، ''نیلا آکاش''، ''کیچڑ'' اور ''تماشہ'' جیسی نظمیں منظر